دستک
مدیر
عنبر شمیم

سہ ماہی

مدیر

عنبر شمیم

معاون مدیران

فہیم انور   ممتاز نظر

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

51/16، کاویز گھاٹ روڈ، شیب پور، ہوڑہ ۔۷۱۱۱۰۲ (مغربی بنگال) انڈیا

اپریل، مئی، جون ۱۹۹۴ء

قیمت:

فی شمارہ : ۲۰؍روپے
زرسالانہ : ۸۰؍روپے
تاعمر زرسالانہ : ۱۰۰۰؍روپے

بیرونی ممالک سے:

زرسالانہ : ۱۲؍امریکی ڈالر (بذریعہ بحری ڈاک)
۲۵؍امریکی ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

- سرورق : احمد سلیم
- خوش نویس : شمیم احمد، ابوالحسن
- تزئین کار : ریاض احمد
- طباعت : ستیہ جگ ایمپلائز کوآپریٹیو انڈسٹریل سوسائٹی لیمٹیڈ
۱۳؍پرفلا سرکار اسٹریٹ۔ کلکتہ-۷۲

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر : عنبر شمیم

فہرست

مضامین

غزلیں

خطوط

نظمیں

افسانے

انشائیہ

عین رشید کی ۵ نظمیں

تراجم

تبصرے

ابتدائیہ

"دستک" کا دوسرا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔

اس شمارے میں سات افسانے ہیں، ان میں سے ۵ فسادات کے موضوع پر ہیں۔ ۶ دسمبر کے سانحہ کے بعد ہندوستان میں فسادات جتنے بڑے پیمانے پر پھوٹ پڑے تھے ان سے ہندوستان کا ہر فرد متاثر تھا۔ آج بھی ان خونیں مناظر کی یاد سے دل دہل جاتا ہے۔ بقول اقبال فنکار معاشرے کا "دیدۂ بینا" ہوتا ہے۔ جسم کے کسی عضو میں تکلیف ہو تو سب سے پہلے آنکھ متاثر ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں قلم خاموش رہے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ زندہ تحریریں ہمیشہ اپنے اردگرد کے ماحول کا اثر قبول کرتی ہیں، اور اپنے عہد کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں جہاں فسادات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے وہیں اردو شعر و ادب نے بھی اپنے ردِ عمل کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ یہ افسانے اس کا ثبوت ہیں کہ سچے فنکار کے قلم کی دھار کبھی کند نہیں ہوتی بلکہ سنگین حالات میں ہی قلم کے جوہر کھلتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن کے نام فیض احمد فیض کے خطوط ان معنوں میں اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں چند ایک کا تعلق کلکتہ یونیورسٹی سے ہے۔ مغربی بنگال کی حکومت نے کلکتہ یونیورسٹی میں

میں اقبال چیئر قائم کی تھی۔ اس چیئر پر تقرر کے لئے فیض صاحب کی طرف سے سلسلہ جنبانی ہوئی لیکن یونیورسٹی کی جانب سے تقرر نامہ جاری ہونے میں تاخیر کے باعث فیض احمد فیض نے "لوٹس" کی ادارت قبول کر لی۔ یہ خطوط شاہد ہیں کہ فیض صاحب بذاتِ خود اس چیئر کے خواہش مند تھے اور انکار کر دینے کے بعد انہوں نے اظہارِ تاسف بھی کیا تھا اور یہی ان خطوط کی اشاعت کا جواز ہے۔

"دستک" کے پہلے شمارے سے متعلق ملک و بیرونِ ملک سے کثیر تعداد میں خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں اپنی پسند ناپسند کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان تمام خطوط کو دستک کے صفحات میں سمونا ممکن نہیں ہے اس کے باوجود اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی اہم خط شائع ہونے سے نہ رہ جائے۔ ان احباب سے، جن کے خطوط شاملِ اشاعت نہیں ہیں، ادارہ معذرت خواہ ہے۔

"دستک" کی اشاعت میں تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ دوسرا شمارہ ۳۲ صفحات کے اضافے کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے مگر قیمت وہی ہے اور اس بات کا وعدہ بھی ہے کہ آئندہ شمارہ ستمبر کے اواخر تک بہر حال منظرِ عام پر آ جائے گا۔ اب یہ قارئین پر ہے کہ وہ اس کی باقاعدگی میں کہاں تک ہاتھ بٹاتے ہیں۔

عنبر شمیم

نیک

خواهشات

کے ساتھ

عارف اقبال

۴۳ - رپن اسٹریٹ - کلکتہ - ۷۰۰۰۱۶

نیک

خواہشات

کے ساتھ

فیاض احمد

۱۲۔ رام لوچن ملک اسٹریٹ، کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۷
رابطہ: ۰۶۸۰ - ۲۳۹
۲۵۴۲ - ۳۳

مضمون

پس ساختیات: پیش منظر
اور مارکسیت سے مکالمہ جاریہ

گوپی چند نارنگ

D-252, Sarvadaya Enclave
New Delhi - 110017

پروفیسر گوپی چند نارنگ ان دنوں ادبی تھیوری کے نئے منظر نامے پر کام کر رہے ہیں۔ ذیل کا مضمون انہوں نے "دستک" کی فرمائش پر بھیجا ہے جس میں نئی ادبی تھیوری کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے اور مارکسیت سے اس کے مکالمے کی نوعیت سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ نئے فکری چیلنج کیا ہیں۔ حال ہی میں موصوف کی کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" بھی منظر عام پر آئی ہے۔

'WHAT ART MAKES US SEE, AND THEREFORE GIVES TO US IN THE FORM OF 'SEEING' 'PERCEIVING' AND 'FEELING', (WHICH IS NOT THE FORM OF KNOWING), IS THE IDEOLOGY FROM WHICH IT IS BORN, IN WHICH IT BATHES, FROM WHICH IT DETACHES ITSELF AS ART, AND TO WHICH IT ALLUDES'

ALTHUSSER
IN 'A LETTER ON ART'

اس مضمون میں ہم مختصر طور پر یہ دیکھیں گے کہ پس ساختیاتی تھیوری کی موجودہ صورتِ حال کیا ہے، یعنی ساختیات سے پس ساختیات تک کی پیش رفت کیا رہی ہے اور وہ کون سے نکات ہیں جن پر اجماعِ رائے ہے تاکہ آئندہ کے امکانات کا اندازہ کیا جا سکے۔ موضوعِ انسانی کی بے دخلی کے علاوہ متن کی خود مختاری اور معروضیت کے طلسم کا ٹوٹنا، معنی کا وحدانی نہ ہونا، معنی کے تعامل میں قاری کا در آنا، نیز متن کا آئیڈیولوجیکل تشکیل ہونا، یہ پس ساختیات کے خاص مسائل ہیں جنہوں نے تھیوری کی سطح پر ادبی فکر کو نئی سمت و رفتار دی ہے۔

ساختیات سے پس ساختیات کی تبدیلی بہت سوں کے لئے واضح نہیں ہے۔ ۱۹۷۰ کے لگ بھگ جن فلسطینیوں کی تحریروں سے پس ساختیات کا آغاز ہوا، ان میں سے زیادہ تر فرانسیسی تھے لیکن فرانس میں اسے پس ساختیات نہیں کہا گیا، یہ نام باہر والوں کا دیا ہوا ہے اور شروع میں اس کے حدود بہت واضح نہیں تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو دس بارہ برس پہلے جوناتھن کلر کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ، ساختیات اور پس ساختیات کی حدِ امتیاز خاصی مبہم ہے۔ (ON DECONSTRUCTION, 1983, P.30) لیکن یہ صورتِ حال اب بدل چکی ہے اور نہ صرف انحراف مکمل ہو چکا ہے بلکہ پس ساختیاتی موقف فلسفیانہ اعتبار سے پوری طرح مستحکم بھی ہو چکا ہے۔ اس بارے میں اس امر کو نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ سابقہ POST "مابعد" کے معنی میں تو ہے ہی، اس میں "مبنی بر"، یا "منحصر"، کا مفہوم بھی شامل ہے، یعنی بنیاد وہی ہے، لیکن ساختیات کی فکری پروجیکٹ میں جو کوتاہیاں تھیں، پس ساختیات میں نہ صرف انہیں نشان زد کر کے ان سے انحراف کیا گیا، بلکہ دوسرا موقف اختیار کیا گیا، اور نتیجتاً بہت سی ترجیحات بدل گئیں۔

مزید یہ کہ پس ساختیات کا اثر پہلے امریکہ میں ہوا اور بعد میں برطانیہ میں، لیکن برطانیہ میں جو اثر مرتب ہوا وہ نوعیت کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ امریکہ میں پس ساختیات کو زیادہ تر ان لوگوں نے گلے لگایا جو امریکی نیو کرٹیسزم (نئی تنقید) کی معروضیت سے نجات کی راہ ڈھونڈ رہے تھے جب کہ برطانیہ میں پس ساختیاتی فکر کو ریڈیکل اور سیاسی قوت کے طور پر دیکھا گیا۔ یہاں آلتھوسے کے خیالات ستر کی دہائی سے بھی پہلے پہنچ چکے تھے۔ امریکہ میں سب سے زیادہ اثر دریدا اور لاکاں کا ہوا، آلتھوسے کو وہاں شروع میں نظر انداز کیا گیا، جب کہ برطانیہ میں سب سے زیادہ اہمیت آلتھوسے کو حاصل تھی، لاکاں، دریدا، فوکو کے اثرات بعد میں آئے۔ یہ بات خاصی اہم ہے کہ برطانیہ میں پس ساختیات اور ردِ تشکیل کو نو مارکسی رویوں اور بائیں بازو کے دانشورانہ ثقافتی رویوں کی توسیع کے طور پر دیکھا گیا اور ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس کی خاص وجہ تھی۔ مارکسیت میں مرکزیت فرد یا شعورِ انفرادی کو حاصل نہیں، یعنی فرد یا اس کا شعورِ انفرادی کو حاصل نہیں، یعنی

فرد یا اس کا شعور آزاد عامل نہیں۔ پس ساختیات بھی فرد کی موضوعیت کو اہمیت نہیں دیتی اور موضوعِ انسانی کو رد کرتی ہے، لہٰذا پس ساختیاتی فکر کا یہ موقف مارکسیت کے متخالف نہیں بلکہ موافق ہے، اور یوں ماورائی موضوع کی بے دخلیت اور بورژوا موضوع کی نفی تصوراتی طور پر ہم آہنگ ہو گئے۔ بہت سے برطانوی مصنفین کے یہاں یہ دونوں رویے مل کر عمل آرا نظر آتے ہیں۔ انتونی ایسٹ ہوپ نے اپنی جامع کتاب

ANTONY EASTHOPE,
BRITISH POST-STRUCTURALISM SINCE 1968
(ROUTLEDGE, LONDON 1988)

میں اس مسئلے سے کھل کر بحث کی ہے اور متعدد مارکسی مصنفین مثلاً کولن میکیب، کیتھرین بلسے، تورل موئے ٹونی بینٹ، ٹیری ایگلٹن اور رابرٹ ینگ کی تصانیف سے بحث کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ پس ساختیات نے ان سب کے لئے ترغیبِ ذہنی فراہم کی اور ان کی مارکسی فکر پر پس ساختیات کا اثر صاف دیکھا جا سکتا ہے، نیز جہاں تک ریڈیکل فکر کا تعلق ہے دونوں کے ذہنی مکالمے میں ہنوز کمی کے کوئی آثار نہیں۔ ایسٹ ہوپ کا کہنا ہے کہ ادب کے علاوہ ثقافت کے دیگر شعبوں مثلاً آرٹ، فلم، موسیقی میں پس ساختیات کا اثر دیکھا جا سکتا ہے، اور تو اور تحریکِ نسوانیت کے مباحث میں بھی پس ساختیاتی فکر سے مدد لی گئی ہے جس کا بہترین ثبوت کرس ویڈن کی کتاب ہے :

CHRIS WEEDON,
FEMINIST PRACTICE AND POSTSTRUCTURALIST THEORY
(OXFORD, BLACKWELL 1987)

اس وقت ادبی تھیوری کا ایک اہم رجحان یہ بھی ہے کہ مارکسیت کو پس ساختیاتی فکر کی روشنی میں از سرِ نو دیکھا جا رہا ہے کئی مفکرین جو مارکسیت کو نہیں مانتے، مارکسیت میں دلچسپی رکھتے ہیں اور مارکسیت ان کے افکار کا اہم عنصر ہے۔ اس رویے سے پیدا ہونے والا ایک رجحان 'نئی تاریخیت' ہے جسے 'تہذیبی مادیت' بھی کہا جا رہا ہے۔ اس کی بنیاد روسی ہیئت پسند باختن کے خیالات پر ہے جس کا خاص سروکار ادب اور تاریخ کے رشتے سے ہے۔ ویسے پس ساختیات اور مارکسیت میں رابطے کی ایک خاص وجہ آلتھیوسے کے افکار سے دلچسپی بھی ہے جس نے مارکسیت کے اندر رہتے ہوئے ادب اور آرٹ کی نسبتاً خودمختاری کی راہ کھول کر ان لوگوں کے لئے گنجائش پیدا کر دی جو مارکسیت کے مقاصد سے تو ہمدردی رکھتے تھے لیکن مارکسیت کی کلیت پسندی اور جبریت سے نالاں تھے۔

ایک اور وجہ لاکاں کی تحلیلِ نفسی کا اثر ہے۔ لاکاں کی بنا پر آلتھیوسے نے جس طرح آئیڈیولوجی کے تصور کو بدل کر رکھ دیا۔ اس میں بھی دانش ورانہ روایت کے لئے خاصی کشش ہے، یعنی جب موضوعِ انسانی خودمختار یا خودکفیل نہیں تو رد و اختیار کا مرکز تو اپنے آپ منہدم ہو گیا۔ بقول آلتھیوسے انسان خود مختلف آئیڈیولوجیکل وسائل مثلاً خاندان، مذہب، ثقافت، تعلیم، میڈیا، آرٹ، ادب وغیرہ سے بطور ذہنی تشکیل مرتب ہوتا ہے، لیکن اسے باور یہ کرایا جاتا ہے کہ وہ یہ تاثر دے کہ وہ کسی کی پیداوار نہیں (اگرچہ انسان کو کوئی آزادی سوائے اس کے نہیں کہ وہ اپنی غلامی کو بے چون و چراں تسلیم کر لے) اس صورتِ حال میں وہ تمام زندہ تجربہ جسے انسان جھیلتا ہے اور جس میں زندگی کرنے پر وہ مجبور ہے، یعنی علاوہ اپنے حیاتیاتی جسم کے انسان جو کچھ بھی ہے وہ اس کی آئیڈیولوجیکل صورتِ حال ہے۔

بائیں بازو کے فکری حلقوں کے پس ساختیات سے متاثر ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ساختیات کے چلن کے بعد جیسے جیسے اس کمی کا احساس ہوا کہ ساخت کا تصور کس کے لئے؟ اور پس ساختیاتی تھیوری میں جیسے جیسے اس کا جواب دیا جانے لگا کہ معنی وحدانی نہیں ہے تو قاری اور قرأت کا تفاعل اپنے آپ در آیا۔ قاری کی جہت کا کھلنا تھا کہ ادب سے متاثر ہونے کا مسئلہ بھی خود بخود زیرِ بحث آ گیا اور یوں ادب کے سیاسی ایجنڈا کی راہ کھل گئی جس میں مارکسی فکر کے لئے خاصی کشش ہے۔ پس ساختیات میں اس جہت کا کھلنا ایک بنیادی تبدیلی تھی۔ ساختیات کو فعلِ لازم اور پس ساختیات کو فعلِ متعدی اسی لئے کہا گیا ہے کہ از روئے ساختیات و پس ساختیات ادب اور آرٹ ایسی سرگرمی ہے جس کا اثر، دوسرے، پر مرتب ہونا لازمی ہے۔ ایسٹ ہوپ نے چند لفظوں میں اس تبدیلی کی ساری بات کہہ دی ہے:

STRUCTURALISM BECOMES TRANSFORMED INTO POST-STRUCTURALISM WHEN THE STRUCTURES OF THE TEXT ARE SEEN TO BE ALWAYS STRUCTURES IN AND FOR A SUBJECT (READER AND CRITIC). THE TEXT OF STRUCTURALISM IS INTRANSITIVE, THAT OF POST-STRUCTURALISM TRANSITIVE'

غرض ادبی سرگرمی میں قاری کے تفاعل کے در آنے سے متن کی معروضیت اور خود کفالت کا مفروضہ شکست ہو گیا۔ ادب کے اثر کی بحث بجائے خود سیاسی نوعیت کی ہے اور مارکسی جہت رکھتی ہے۔ اس موقف کو

اختیار کرتے ہی خود بخود متن کی نوعیت بدل سکتی ہے۔ بلکہ وہ تمام ECRITURE متن جو فوری اعتبار سے قاری کی تشفی نہیں کرتے، یعنی اپنا معنیاتی ستر ظاہر نہیں کرتے، قاری کی اشتہا کو بڑھا دیتے ہیں اور قاری کی خواہش کو جگا دینا بجائے خود انقلابی عمل ہے۔ میکیب جس پر کیمبرج میں ہنگامہ ہوا تھا جوائس کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے :

'JOYCE, SPECIFICALLY THAT OF FINNEGANS WAKE, LEADS TO REVOLUTIONARY POLITICS BECAUSE IN DENYING THE READER'S PLEASURE, IT OPENS THE READER'S DESIPE'

بہرحال لگتا ہے کہ پس ساختیاتی تھیوری اپنی تکمیل کر چکی ہے۔ بارتھ، لاکاں، فوکو کا انتقال ہو چکا ہے، آلتھیوسے بھی بالآخر ختم ہو گیا۔ دریدا، کرسٹیوا، رکیو، بودریلارڈ، دے لیوز جیمسن اور ایڈورڈ سعید البتہ موجود ہیں، لیکن ان کے بنیادی خیالات سامنے آ چکے ہیں اور تھیوری راسخ ہو چکی ہے، چنانچہ ساختیات کے بنیادی موقف، اس سے انحراف اور پس ساختیات کے امتیازات اور ترجیحات کے بارے میں گفتگو اب اطمینان سے کی جا سکتی ہے: واضح رہے کہ ساختیات اور پس ساختیات کا رشتہ صرف اتنا نہیں ہے پس ساختیات کا فکری سفر بعد میں شروع ہوا بلکہ یہ کہ پس ساختیات کے بہت سے تصورات یا تو ساختیاتی فکر کی توسیع ہیں یا ساختیات سے انحراف ہیں، لیکن یہ انحراف ساختیات ہی کے کسی نہ کسی مقام سے ہے۔ پہلے بنیادی موقف نگاہ میں رہے، پھر امتیازات کو نکات کی حد تک مختصراً نشان زد کر دیا جائے گا (تفصیلی بحثیں پہلے آ چکی ہیں) :

(۱) ساختیاتی فکر نے زبان کے تصور کو بدل دیا۔ سوسیئر کے فلسفۂ لسان میں جو بصیرتیں ہیں اور جن پر ساختیاتی فکر قائم ہے، ان کا سب سے زیادہ اثر بالخصوص فلسفے کی دنیا میں اور ادبی تھیوری میں معنی کے تصور پر پڑا یعنی زبان اشیا کی فہرستِ تسمیہ (NOMEN CLATURE) نہیں ہے بلکہ نظامِ نشانات (SIGN-SYSTEM) ہے جو رشتوں کی ساخت سے کارگر ہوتا ہے، اور رشتوں کا یہ نظام من مانا (ARBITRARY) ہے۔

(۲) زبان کا مجرد نظام "لانگ" ہے اور انفرادی تکلم "پارول" ہے۔ پارول کی ہر مثال خواہ وہ کیسی ہو لانگ کے سرچشمۂ فیضان سے ہے۔

(۳) نشان (SIGN) مجموعہ ہے معنی نما (SIGNIFIER) اور تصورِ معنی (SIGNIFIED) کا جو دونوں مل کر بطورِ وحدت عمل آرا ہوتے ہیں۔

(۴) زبان کا نظام چوں کہ من مانا ہے اور معنی چوں کہ اس نظام کی رو سے طے ہوتے ہیں، لہٰذا لفظ اور معنی کا رشتہ فطری اور لازمی ہے۔ معنی دیے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ اپنے تفریقی رشتوں سے قائم ہوتے ہیں۔

(۵) کسی معنیِ مطلق، اس کی اصل یا جوہر کا چوں کہ زبان سے پہلے یا زبان کے باہر ہونا ثابت نہیں اور معنی چوں کہ از روئے ساخت قائم ہوتے ہیں، وہ تمام تصورات جو ماورائی (TRANSCENDENTAL) نوعیت کے ہیں یا زبان کے نظام سے باہر کسی مابعد الطبیعیاتی مرکز پر قائم ہیں، اپنے آپ ساقط ہو جاتے ہیں۔ موضوعِ انسانی کا رد اسی حوالے سے ہے۔

اب مختصراً دیکھیے کہ پس ساختیات میں کون سی توقعات پلٹ گئیں، کن باتوں سے انحراف ہوا، اور کیا نئی ترجیحات قائم ہوئیں:

(۱) ساختیات کے مندرجہ بالا تمام مقدمات سے پس ساختیات میں اتفاق ہے سوائے شق تین میں معنی کی وحدت کے تصور سے، اور اس کے چیلنج ہونے سے بہت سی توقعات پلٹ گئیں اور ترجیحات بدل گئیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ معنی کی وحدت کے تصور کی بدولت ساختیات ایک سائنسی پروجیکٹ تھا، اس کی تمام تر توقعات سائنسی تھیں، معنی کی وحدت کے الٹ ہونے سے سائنسی ہے۔ اس کا جھکاؤ تخلیقیت اور تکثیرِ معنی کی طرف ہے جو وحدانی نظم و ضبط کے خلاف پڑتے ہیں۔

(۲) سگنیفائر اور سگنیفائڈ کے مجموعے سائن (نشان) میں وحدت اس لئے نہیں ہو سکتی کیوں کہ معنی قائم بالذات نہیں، یہ تفریقی رشتوں سے پیدا ہوتا ہے، لہٰذا جتنا موجود ہے اتنا التوا میں بھی ہے۔ پس معنی عدم استحکام اور بے مرکزیت کا شکار ہے۔

(۳) معنی چوں کہ عدم قطعیت کا شکار ہے، متن خود کار اور خود کفیل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا متن کی معروضیت فریبِ نظر ہے۔

(۴) موضوعِ انسانی چوں کہ بے مرکز ہے، مصنف معنی کا مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہے۔ متن کی تکمیل کے بعد مصنف متن سے الگ ہو جاتا ہے جبکہ متن سے اخذِ معنی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

(۵) متن میں معنی بالقوۃ ہیں، وہ قاری ہے جو انہیں موجود بناتا ہے۔ معنی کے تفاعل میں متن، قاری، قرأت تینوں کی اہمیت ہے۔

(۶) قرأت کا تفاعل چوں کہ عملِ جاریہ ہے اور کوئی قرأت یا تشریح آخری تشریح نہیں ہے، لہٰذا تاریخیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۷) مصنف اور قاری دونوں چوں کہ ڈسکورس کی تشکیل ہیں، ادب میں کوئی موقف، معصوم موقف نہیں، یعنی ادب میں کوئی چیز غیر آئیڈیولوجیکل نہیں ہو سکتی۔

(۸) معنی کا تفاعل چوں کہ قاری ہونے والے اثر سے جڑا ہوا ہے، ادب کی سیاسی جہت سے انکار ممکن نہیں۔

(۹) زبان کا نظام ہی چوں کہ ایسا ہے کہ لفظ وہ معنی دیتے ہیں جو وہ دیتے ہیں (معمولہ معنی) اور وہ معنی بھی جو وہ بظاہر نہیں دیتے (غائب معنی) رد تشکیل معنی کے "دوسرے پن" پر زور دیتی ہے یعنی جس معنی کو بوجوہ نظر انداز کیا گیا یا اقتدار کے کھیل میں دبا دیا گیا۔ گویا متن کو مطلوبہ یا معمولہ معنی کے خلاف بھی پڑھا جا سکتا ہے یہ رویہ باغیانہ مضمرات رکھتا ہے۔

(۱۰) معنی کی وحدت چوں کہ نظری ہے اور اخذِ معنی کا عمل چوں کہ تاریخی ہے اور زبان میں اس کا کوئی آخری سرا نہیں، اس لئے سوسیئر کے تصور لانگ کے ماڈل کی بنا پر یہ سوال کہ کیا ادب کی شعریات یا ادب فہمی کے جملہ اصول و ضوابط کا کلی نظام مرتب کیا جا سکتا ہے، اس کا جواب اثبات میں ممکن نہیں۔ نیز متن چوں کہ متعین ہے اور قرأت عملِ جاریہ ہے، یہ دونوں جدلیاتی طور پر کارگر رہتے ہیں، لہٰذا معنی خیزی میں کوئی مقام آخری مقام نہیں۔ اس لئے کسی نظریے کی ضابطہ بندی بھی ممکن نہیں۔ ضابطہ بندی یا نظام سازی کلیت پسندی یا آمریت کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ پس ساختیاتی فکر ہر نوع کی ضابطہ سازی کے خلاف ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اختصار کے پیش نظر ان شقوں کی حیثیت "سوترو" کی ہے جن کے اطلاق کے امکانات ان گنت ہوا کرتے ہیں، لیکن مضمرات یہاں بھی کچھ کم نہیں، تفصیل دوسرے مضامین میں پیش کی جا چکی ہے۔ غرض بستار بہت، لیکن پس ساختیاتی فکر میں جو کچھ بھی ہے انہیں میں کسی نہ کسی شق سے مشتق ہے۔

●●
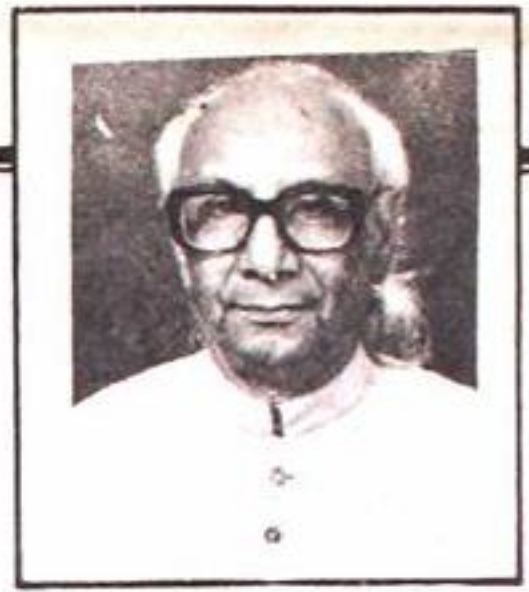
کیا اکبر الہ آبادی صرف طنز و مزاح نگار تھے؟

عبدالقوی دسنوی

Dr. Abdul Qavi Dasnavi

2, Prince Colony,
Nematpura, IdgahHil
Bhopal - 462001

کیا اکبر الہ آبادی صرف طنز و مزاح نگار تھے؟ یہ سوال شاید اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اکبر الہ آبادی کا نام زبان پر آتے ہی ہر شخص کے سامنے طنز و مزاح نگار اکبر الہ آبادی آجاتے ہیں اس لئے کہ ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کو بڑی شہرت اور مقبولیت رہی ہے۔ ان کی اس طرح کی شاعری کی قبولیتِ عام کی وجہ ان کا زوال پذیر دور تھا جس میں طنز و مزاح سے اصلاح کا بڑا اچھا کام لیا جاسکتا تھا اکبر الہ آبادی نے اپنے زمانے کے حالات اور تقاضے کو سمجھا اور اس کی اصلاح کا ذریعہ اپنی اس رنگ کی شاعری کو بنایا جسے ان کے دور نے اور بعد کے آنے والے دور نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چنانچہ ان کے اس رنگ کے اشعار زبان زد خاص و عام ایک مدت تک رہے اور آج بھی حسب ضرورت لوگ تحریر و تقریر میں ان کے طنز و مزاح سے بھرپور اشعار استعمال کرتے ہیں

اس سلسلے میں ذرا تفصیل میں جایا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اکبر الہ آبادی ابھی گیارہ برس ہی کے تھے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی جس میں بڑا خون خرابہ ہوا بڑی تباہی آئی۔ جو کل تک خوش حال تھے افلاس کے شکار ہو گئے تھے جو مکانوں میں سکون کی زندگی گزار رہے تھے بے گھر ہو کر مارے مارے پھرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ فاقوں سے دوچار ہو گئے تھے بے یار و مددگار ہو گئے تھے ـــــــ دلی اجڑ گئی تھی، دوسرے بہت سے شہر اور بستیاں برباد ہو گئی تھیں۔ لوگ بکھر گئے تھے عزت و آبرو خاک میں مل گئی تھی، انگریز سات سمندر پار حاکم بن گئے تھے۔ اور غلامی کا خیال ہندوستانیوں کو بری طرح ستانے لگا تھا، مذہب کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پریشان کرنے لگا تھا، اور معاشرے میں برائیوں کے داخل ہونے کا احساس شدید ہونے لگا تھا۔ سب کی وجہ انگریز، ان کی تعلیم اور ان کی لائی ہوئی

تہذیب سمجھی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بھڑکنے لگا تھا وہ ان کے ساتھ لائی ہوئی زبان اور تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ایسے حالات میں جب اکبر الٰہ آبادی نے اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے انگریزی تہذیب، انگریزی زبان اور ان کی لائی ہوئی دوسری چیزوں کو نشانہ بنایا تو اہل ہند نے ایک خاص قسم کا سکون محسوس کیا اور ان میں اکبر کا اس طرح کا کلام مقبول ہوا اور زبان زد خاص و عام ہوا۔ ہندستانیوں کو اکبر الٰہ آبادی کے کلام میں اپنی شکست خوردگی کی تکلیف سے نجات ملتی محسوس ہوئی۔ اور انگریزوں سے شکست کھانے میں ہندستانیوں کی انا کو جو ٹھیس پہنچی تھی اس کو تسکین حاصل ہوئی۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ انگریزوں سے اب بھی بہتر ہیں اور ان کی لائی ہوئی ہر چیز میں خرابی اور برائی ہے۔

اکبر الٰہ آبادی کے اس طرح کے کلام کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کے کلام کی زبان تھی وہ انگریزی الفاظ کو اپنی شاعری میں جگہ دے کر بھی طنز و مزاح پیدا کرتے تھے اور اس طرح انگریزیت کے خلاف جذبات بھڑکاتے رہتے تھے۔

اکبر کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کا جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ______ غلامی کے اثرات قوم پر جو کچھ پڑ رہے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ عام بول چال میں انگریزی لفظوں کا استعمال شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ایک طبقہ میں بے چینی پیدا ہو رہی تھی، ان کو خوف محسوس ہونے لگا تھا کہ اس طرح ان کی زبان اور تہذیب کو نقصان پہنچے گا چنانچہ اکبر الٰہ آبادی نے اس کا مذاق اس طرح اڑایا:

وہ مس بولی میں کرتی آپ کا ذکر اپنے فادر سے
مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے پاگل کے مافک ہے

یا کبھی انگریزی لہجے سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس سے بدظنی پیدا ہو:

مرٹ بولو ایسی باٹ کہ ہم دیسی لوگ ہیں
صاحب کا نام دل کو بہت بھانے مانگتا

اس زمانے میں انگریزی تعلیم کے اثر نے مذہب سے بے گانگی شروع کر دی تھی جس کا اکبر الٰہ آبادی کو شدت سے احساس ہو گیا تھا انہوں نے اس کے خلاف اس طرح آواز اٹھائی:

کہاں کے مسلم، کہاں کے ہندو، بھلائی سب نے ہیں اگلی رسمیں
عقیدے سب کے ہیں تین تیرہ، نہ گیارہویں ہے نہ اشٹمی ہے

بقیہ

گیا

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اسی انگریزی تعلیم کی وجہ سے عورتوں میں بے پردگی کا رواج بڑھنے لگا جس کی طرف اکبر الہ آبادی نے نہایت دلچسپ انداز سے اشارہ کیا ہے :

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اکبر نے لڑکیوں میں انگریزی تعلیم کے برے نتائج کا پردہ چاک کرتے ہوئے بعض خرابیوں کی طرف متوجہ کرنے کی نہایت سلیقہ سے کوشش کی ہے ۔ ان کے یہ اشعار بہت مقبول ہوئے ہیں :

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں ، وہ سبھا کی پری نہ ہوں

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

حالانکہ اکبر الہ آبادی لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف نہ تھے :

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو بے شعور ہے
حسنِ معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے
ان پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بندوبست
چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شادمست

ایک طرف اہلِ اردو پر اردو سے بے توجہی پر اس طرح طنز کرتے ہیں :

قوم کیسی کس کو اب اردو زبان کی فکر ہے
غم غلط کرنا ہے بس اور آب ودانہ کی فکر ہے

اردو والوں کے لئے یہ شعر آج اور زیادہ بامعنی ہو گیا ہے :۔
اکبر الہ آبادی کے یہاں اس طرح کے طنز و مزاح میں ڈوبے ہوئے اشعار بھی کافی ملتے ہیں :

بتائیں آپ کے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

اکبر کی اس طرح کی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کو عام طور سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اگرچہ شعراء نے اس خوشگوار رنگ کو اختیار کرنے کی کامیاب کوشش نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر الہ آبادی کی شاعری کا یہ رنگ ان ہی پر ختم ہو گیا۔

البتہ اس میدان میں تنہا علامہ اقبال نظر آتے ہیں جنہوں نے اس رنگ کو اختیار کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن جلد ہی وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اس میدان سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان کے اس رنگ کے کلام کو " اکبری اقبال" کہا گیا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی　　ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر　　وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین　　پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اٹھا کر پھینک دو باھر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل صدارت بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے تھے نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکبر صرف طنز و مزاح کے شاعر نہیں تھے، بلکہ اصل حیثیت ان کی غزل گو کی تھی۔ انہوں نے بحیثیت غزل گو کے ہی شاعری کا شروع کی تھی جس کی ابتدا قدیم طرز کی غزل سے ہوئی تھی۔ وحید الہ آبادی جو آتش کے تلامذہ میں سے تھے اکبر الہ آبادی کی شاعری میں پہلے اور آخری استاد تھے۔ اکبر الہ آبادی انہیں صرف چند غزلیں دکھلا پائے پھر کسی اور استاد کی طرف رجوع نہیں ہوئے ابتدا میں قدیم طرز کی غزل کہتے رہے، غم جاناں کو زیادہ اہمیت دی، لیکن وہی روایتی عشق محبوب کے ناز و انداز اور غمزے، عاشق کے حصے میں وہی انتظار، اضطراب، آزمائش، شب فرقت، وہی پرانے تراکیب، وہی الفاظ، وہی علامتیں، شیخ، ناصح، واعظ، دوست، دشمن، کعبہ، بت خانہ، برہمن، صبا، صنم، جام، ہجر و وصال بام وغیرہ یا نقد دل، لب جاں بخش، وعدۂ فردا، چشم جاناں، قد رعنا، زلف پیچاں، مآلِ ہستی وغیرہ کا استعمال بار بار ہوا ہے۔ ان ہی سے انہوں نے اپنی غزل کا مزاج اور آہنگ بنایا ہے۔ ملاحظہ کریں:

شوق نظارہ کبھی دل سے نکلتا ہی نہیں
جی ہمارا بے ترے دیکھے بہلتا ہی نہیں

دکھ کے تصور خیالی یار کی پیش نظر
رات بھر مجھ کو شبِ فرقت میں تڑپاتا ہے دل

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اکبر کے یہاں اس دور میں اس سے ہٹ کر الگ رنگ اور مزاج کا کلام نہیں ملتا۔ بلاشبہ ان کے یہاں اس دور میں ایسے بھی ملتے ہیں جو حقیقت سے قریب زندگی کی سچائیوں کا اظہار کرتے ہیں اور ایک خاص کیفیت کے مظہر ہیں اور ایک خاص تاثر چھوڑتے ہیں اور سماجی زندگی اور تہذیبی اقدار کو پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ایک خاص تازگی کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس طرح کے اشعار بہت زیادہ نہیں ہیں۔ ان کے

یہاں اس طرح کے اشعار بھی ملتے ہیں :

غریب خانہ میں للہ دو گھڑی بیٹھو　　بہت دنوں میں تم آئے ہو اس گلی کی طرف

جو گھر میں پوچھے کوئی خوف کیا ہے کہدینا　　چلے گئے تھے ٹہلتے ہوئے کسی کی طرف

انہوں نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی بے مائیگی کا اظہار ملتا ہے اور ایسے واقعات اور حادثات سے بھی پردہ اٹھتا ہے جو زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں مدد کرتے ہیں۔ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جہاں صداقتوں کی مختلف منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور معرفت کی حدود میں داخل ہونے میں آسانی ہوتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں وہ فکر کی بہت زیادہ گہرائی تک نہیں پہنچ پائے ہیں، چند شعر یہ ہیں :

پوچھتا ہوں جو عبث سے مآل ہستی
راستہ گور غریباں کا بتا دیتی ہے
موت سے کوئی نہ گھبرائے اگر یہ سمجھے
کہ یہ دنیا کے بکھیڑوں سے چھڑا دیتی ہے
بزم عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں
کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

یا اس طرح کے اشعار بھی اکبر الہ آبادی کے ہیں :

آپ کے سر کی قسم میرے سوا کوئی نہیں
بے تکلف آئیے کمرے میں تنہا آئیے
پہلے ہی چال آپ کی تھی فتنہ زا حضور
گھنگھرو نے اور فتنہ محشر بنا دیا

اکبر الہ آبادی کے ابتدائی زمانے کا یہ شعر تو اس قدر مقبول ہوا کہ عام طور سے لوگ اپنی تحریر و تقریر میں اپنی مظلومیت کا اظہار کرتے ہوئے اس شعر کو پڑھتے ہیں اور اپنے دل کو تسکین پہنچاتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہ اکبر الہ آبادی کا شعر ہے :

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

لیکن اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وقت اور مشق کے ساتھ ساتھ اکبر الہ آبادی کی

غزلوں میں نئی جان پڑنے لگی، ان کا اپنا ایک مخصوص لہجہ اور مزاج ابھرنے لگا انہوں نے اپنے کلام کو فلسفہ اور حکمت کی راہ سے گزارا اور تجربات سے سجایا، سنوارا اور اس طرح نئے اندازِ فکر کے ساتھ اپنے زمانے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کے یہ اشعار ان کا کچھ اسی قسم کا تعارف کراتے ہیں :

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی
ترک خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا
ہم کو زیر آسماں ہو کر گزرنا ہی پڑا
منزل ہستی میں لٹنے کو ٹھہرنا ہی پڑا
اپنے غم خانہ کا دروازہ بند کرو اکبر
اب سوا موت کے کوئی نہیں آنے والا
دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

لیکن اکبر کے آخری دور کی غزلوں کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ ان میں فکری بلندی، سنجیدگی زندگی کے حقائق کی آئینہ داری اور تجربات کی سچائیاں نہایت سلیقہ اور پراثر انداز سے ملتی ہیں جو غزل کے سانچے اور ڈھانچے، رنگ اور آہنگ کے ساتھ ایک خاص کیفیت پیش کرتی ہیں۔ چند شعر یہ ہیں :-

تو اصل پہ اپنے قائم رہ فطرت کی مگر تحقیر نہ کر
دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر
ہر چند بگولہ مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے اک وجد تو ہے بے چین سہی برباد سہی
چشم خرد سے عار تھا حسن جنوں پسند کو،
عقل نے آنکھ بند کی، اس نے نقاب اٹھا دیا

اکبر الہ آبادی کے معیار اور سنجیدہ غزلوں کو اس مطالعہ کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں مزاحیہ اشعار شامل کر کے ایک نیا اور انوکھا تجربہ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے
تو بے چارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اچھل آیا

پڑ جائیں ابھی آبلے اکبر کے بدن پر،
پڑھ کر جو کوئی پھونک دے اپریل مئی جون،

نہیں بدلی زباں اس شوخ کی یہ کون کہتا ہے"
میں جب جاتا ہوں اس کی بزم میں سٹ ڈاؤن کہتا ہے

مختصر یہ کہ اکبر الہ آبادی کی غزلیہ شاعری مزاج اور معیار کے اعتبار سے اپنا منفرد مقام اور رنگ کے اعتبار سے اپنی نمایاں پہچان رکھتی ہے لیکن ان کے مزاحیہ کلام کی مقبولیت نے ان کے سنجیدہ کلام کی شہرت کو اس حد تک نقصان پہنچایا کہ آج ہم انہیں صرف طنز و مزاح نگار شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

مضمون

یاس یگانہ
منفرد لہجے کا شاعر

خورشید نعمان ردولوی

Sh. Khursheed Noman Rudaulvi

A. Khaliq Flats
180 - A, Pipe Road,
P.O. Kurla (West), Bombay - 400070

عرصے ہوا نقوش۔ لاہور میں عابد علی عابد کی ایک غزل نظر سے گذری تھی جس کا ایک شعر مجھے پسند آیا اور یاد رہ گیا ؎

یادگار فن تنہا، سرخوش سخن تنہا
ان بھری سبھاؤں میں ہم رہے ہیں تن تنہا

جب یگانہ پر لکھنے بیٹھا تو لگا عابد کا یہ شعر میرے حافظے میں در آیا اور اس شعر میں عابد سے زیادہ مجھے یاس یگانہ کی صورت نظر آئی۔

مرزا واجد حسین، یاس عظیم آبادی، شر لکھنوی ایک ہی فرد کے مختلف نام ہیں، مرزا واجد حسین سے یاس عظیم آبادی تک اور یاس عظیم آبادی سے یگانہ چنگیزی، شر لکھنوی تک بڑے فاصلے ہیں، شخصیت میں تبدیلی کی ایک طویل داستان پوشیدہ ہے، اصل شخصیت دراصل مرزا واجد حسین کی ہے جو عظیم آبادی کی ایک معزز شخصیت ہے۔ وہ جب شاعری کے میدان میں آتا ہے تو یاس عظیم آبادی ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ کے لئے جب ترک وطن کرتا ہے تب بھی وہ یاس رہتا ہے لیکن جب لکھنوی شعراء کے زغہ اعداء میں گھر جاتا ہے اور اہالیان لکھنؤ سے معرکہ آرار ہوتا ہے تو یگانہ چنگیزی بن جاتا ہے۔ یاس عظیم آبادی سے یگانہ چنگیزی تک، تبدیلی ایک ردعمل ہے اس گھٹن اور کرب کی جو اسے لکھنؤ میں برداشت کرنی پڑی، ایک چیلنج ہے۔ زبان و ادب کے ان ٹھیکیداروں کے لئے جو کہ اپنے منہ میں زبان رکھ کر دوسروں کو بے زبان سمجھتے یا بنا دینا چاہتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ یاس یگانہ چنگیزی پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ لے دے کے چند مضامین جن میں مجنوں گورکھپوری کا مضمون نگار۔

جنوری ۱۹۴۱ء بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور ان کی شاعری پر پہلی مفید کوشش ہے۔ باقر مہدی کا مضمون۔ یگانہ آرٹ' آجکل دہلی ماہ ۱۹۵۶ء اور راہی معصوم رضا کی تصنیف "یاس یگانہ چنگیزی" اچھی کوشش ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اپنی کتاب "اردو غزل" کے پہلے ایڈیشن میں یاس کا ذکر ہی مناسب نہ سمجھا، رشید احمد صدیقی نے بھی اپنے کتابچے میں انہیں نظر انداز کیا ہے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر یاس یگانہ کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لئے قاری کے پاس سب سے بہتر ذریعہ خود یاس یگانہ کا کلام ہے، یاس یگانہ نے غزلوں کے دو مجموعے "نشترِ یاس" اور "آیاتِ وجدانی" اور رباعیات کا ایک مجموعہ "ترانہ" چھوڑا ہے۔

"نشترِ یاس" کا شاعر ایک مستقل مزاج انسان ہے، وہ بے خوف ہے، نڈر ہے، حوصلہ مند ہے، جدوجہد اس کی زندگی کا شعار ہے، وہ ہار کو بھی جیت مانتا ہے، مصیبت کے پہاڑ کو بھی وقتی سمجھتا ہے، وہ خود اپنے آپ سے مطمئن ہے۔ دنیا کی اس لئے فکر نہیں کرتا، یہ اشعار اس کی آزاد روی کے غماز ہیں۔

میں قفس میں بھی کسی روز نہ خاموش رہا
کشمکش میں بھی طبیعت کا وہی جوش رہا

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیلِ راہِ محبت ہے فیصلہ دل کا

کیا سمجھتے تھے کہ دل سا شیشہ نازک مزاج
چوٹ کھاتے کھاتے اتنا سخت جاں ہو جائے گا

آبلہ پا نکل گئے، کانٹوں کو روندتے ہوئے
سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ کوچہ یار دیکھ کر

یاس کی انا ردعمل ہے اس بغاوت کی جو انہوں نے شعرائے لکھنؤ اہالیان لکھنؤ اور مذہبی ٹھیکیداروں کے خلاف کی، ہر چند کہ ان کی انا کا رخ گمراہی کی طرف رہا، تعمیری سے زیادہ تخریبی رہا، ان کی انا کا اظہار ان کے ان اشعار سے جذب ہوتا ہے۔

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر، اسے عیب جانئے یا ہنر
وہی بات آئی زبان پر جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشہ سے مرجانا نہیں آتا

میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک تھا

خضرِ منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں
مرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

دل کو لہراتا ہے ہنگامہ زندان بلا
شور ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاسؔ کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

بے نیازی کی بھی کوئی حد ہے آخر کب تلک
ہاتھ اٹھاؤ تو کہیں یاسؔ مناجاتوں سے

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانا کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

منہ جو تکتی ہے مرگِ دشمن کا
ایسی تلوار پر خدا کی مار

زمانہ لاکھ گھر جائے خود اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہے

اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی لیکن ان اشعار سے یاسؔ کی "انا" کا مزاج سمجھا جاسکتا ہے یاس کی یہ انا جب تک قابو میں رہی ایک اچھی چیز رہی لیکن جب بے قابو ہوگئی تو ان کی سر بازار رسوائی کا بھی سبب بن گئی، یاس کی اس "انا" کو اقبال کے "ابلیس" کی "انا" کا مترادف سمجھا جاسکتا ہے۔ یاس کی شاعری میں کسی منظم فلسفہ حیات کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی خود یاس نے اپنی شاعری میں کی۔ فلسفہ حیات کی موجودگی سے انکار کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"میری حقیقت فلسفہ کی کوئی پیچیدہ گرہ نہیں، سیدھی سادی زندگی ہے۔"
یگانہ مکتوب کارروان جولائی ۵۹ء ص ۸

لیکن باقر مہدی کا اصرار ہے کہ ان کے یہاں ایک فلسفہ حیات ملتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"یگانہ کا فلسفہ حیات ایک جامع صورت میں نہیں ملتا کیوں کہ ایک غزل گو
شاعر کے یہاں فلسفہ حیات ایک جامع صورت میں نہیں ملتا کیوں کہ ایک
غزل گو شاعر سے اس کو توقع کرنا بے سود ہے۔

باقر مہدی کی اس بات کو اگر صحیح مان لیا جائے تو غالباً یہ ان کی "انا" کا فلسفہ یا فلسفہ اثبات خودی ہوگی لیکن اس کی صراحت باقر مہدی نے نہیں کی ہے۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ زندگی کو متحرک اور ناقابل فنا سمجھتے ہیں اور اس کے ارتقا میں یقین رکھتے ہیں۔

یگانہ مذہب سے بیگانہ نہ تھے اور نہ مذہب کے خلاف، کٹھ ملاؤں سے ان کو نفرت تھی، شیخ و برہمن سے وہ نالاں تھے، ایک شعر میں وہ لکھتے ہیں۔

بہت میں نے ٹٹولا جادۂ شیخ و برہمن کو
کوئی آسان ہے ناہموار کا ہموار ہو جانا

اس غزل کا ایک مشہور زمانہ شعر ہے۔

عجب کیا ہے، ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

یاس جو اپنی گرم رفتاری کی ٹھوکر سے زمانے کے بلند و پست کو ہموار کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے جادۂ شیخ و برہمن کی ناہمواری کو ہموار کرنے سے خود کو قاصر پاتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ ان مذہبی ٹھیکیداروں کو شکست دینا اور نجات پانا آسان کام نہیں ہے، وہ واعظ و مولوی پر بھرپور طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظ مکّار ڈراتا ہے مجھے

اس شعر میں کس قدر کاری وار وہ ایسے ہی لوگوں پر کرتے ہیں

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انسان کا ایسا خبطِ مذہب کیا

یاس کو اس خبطِ مذہب سے چڑ ہے وہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

پڑھ کے دو کلمے اگر کوئی مسلمان ہو جائے
پھر تو حیوان بھی دو روز میں انسان ہو جائے

یاس کا ایک مشہور شعر ملاحظہ ہو۔

کعبہ کا سفر ہی کیا ہے گھر سے در تک
دل سے دل تک مگر ہے منزل بھاری

اس شعر کی اصل خوبی یہی ہے کہ ان کو وہی شعر اچھا لگتا ہے جو دلوں کو جوڑ دے، ان اشعار کی روشنی میں ان کی یہ رباعی مذہب کی طرف ان کے رویہ کی مکمل طور سے صراحت کرتی ہے۔

خبطِ مذہب ہو خواہ تحفہ فکر جس سے پایا اس کے سر دے مارا
بندگی کا ثبوت دوں کیوں کر اس سے بہتر ہے کیجیے انکار

یاس کو اپنے وطن عظیم آباد سے ہر محب وطن کی طرح بہت محبت تھی ہر چند کہ انہوں نے ترکِ وطن کیا غریب الوطن اور تنہائی میں یادِ وطن ان کو ستاتی ہے۔

لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامن دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے
شام غربت بھی ہے روشن واہ ری یادِ وطن
یاد کیا ہے اک اندھیرے کا اجالا دل میں
دل جلا کر وادی غربت کو روشن کر چلے
خوب سوجھی جلوۂ شام غریباں دیکھ کر

سرزمین لکھنؤ جس سے انہوں نے وطن چھوڑنے کے بعد دل لگایا تھا وہی آخر میں ان کے خون کی پیاسی ہو گئی لکھتے ہیں ؎

وطن کو چھوڑ کر جس سرزمین کو دل لگایا تھا
وہی اب خون کی پیاسی ہوئی ہے، کربلا ہو کر

یہ شعر ان کے دوسرے مجموعہ کلام "آیات وجدانی" کا پہلا شعر ہے اور یہی دراصل اس شکست کی آواز ہے جو کہ یاس سے ہوتی ہوئی یگانہ تک پہنچی ہے۔

حسن و عشق کا معیار بھی یگانہ کے یہاں اردو شاعری کی روایت سے مختلف ہے،
یگانہ حسن کو کسی ذات میں تصور کر کے اس کے اثرات میں بیان کرتے وہ حسن کو سراپا و مجسم ایک مستقل ہستی

سمجھ کر خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس سے بیان میں ندرت اور اشعار میں معنویت بڑھ جاتی ہے وہ لکھتے ہیں[5]

وہ حسن ہی کیا ہے جو گلے کٹوائے
فتنے برپا کرے، قیامت ڈھائے
دیکھا ہوگا مگر نہ دیکھا ہوگا
وہ حسن جسے دیکھ کے چپ لگ جائے

یاس کے یہاں زندگی کو اولیت حاصل ہے اس کے حسن و عشق دونوں کے لئے ان کا رویہ حقارت آمیز ہے، عشق کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

عشق ہی عین زندگی تو نہیں
ہاں مگر زندگی کا آلہ کار

یاس نے زندگی کے کوہ گراں کو جس طرح اٹھایا وہ ان کا دل و جگر تھا لیکن مایوس کن حالات میں بھی وہ مایوس ہونے سے انکار کرتے ہیں، زندگی کے بارے میں ان کا نظریہ بہت واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"زندگی کے تلخ تجربوں سے دوچار ہونا اور بات ہے اور زندگی سے بیزار ہونا اور بات ہے، میں کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہوا ہاں دل جب تک زندہ ہے زمانے کے سرد گرم سے متاثر ہونا، ایک قدرتی امر ہے مگر اس کے لئے یہ لازم ہے کہ تلخ تجربات سے نظریۂ حیات میں بھی تلخی پیدا ہو جائے۔ اور انسان زندگی جیسی نعمت سے آزاد ہو جائے۔"

یاس یگانہ کا یہ اقتباس بڑے جیالے اور دل والے کا کام ہے، یاس کی شاعری کا سارا حسن اس مردانگی و توانائی میں مضمر ہے جو کہ زندگی بھر کی تلخی و تلخ کامی کے بعد بھی اس طرح قائم دائم رہا جو کہ روز اول سے تھا، یگانہ کے لہجے میں جو کھنک، مزاج میں جو کڑک اور آواز میں جو صلابت ہے وہ بے مثل ہے، وہ اپنے آدرشوں پر تا حیات سختی سے عمل پیرا رہے وہ ٹوٹ سکتے تھے لیکن جھک نہیں سکتے تھے۔

زبان و بیان پر یگانہ کی گرفت بہت مضبوط تھی ان سے ہر ادب نواز واقف ہے۔ معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۴ء میں ان کی شاعری کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ انتہائی صائب ہے۔ لکھتے ہیں۔

"یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مرزا یاس یگانہ اپنے وقت کے ایک کامل شاعر ہیں، ان کے خیالات بلند، زبان ستھری، ترکیبیں چست اور کلام حشو و زوائد سے پاک ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں ان کے ہنگاموں کے باعث مقید

انقلاب پیدا ہوا۔"

اقبال کا فردِ واحد جماعتی احساس سے بالکل عاری نہیں ہے لیکن اس کی شدید انا نے اسے غیرت مند بنا دیا ہے اس لئے جب وہ خدا کو مخاطب کرتا ہے تو اس کا لہجہ اقبال کے مومن سے مختلف ہو جاتا ہے، وہ کہتے ہیں۔

صد رفیق و صد ہمدم، پر شکستہ و دل تنگ
داور انمی زیبد بال و پر بمن تنہا

مجنوں گورکھپوری کی رائے میں "یگانہ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی جبر دتی رخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔"

یاس کی سرکشی اور ضد نے ان کے کلام میں جو حسن اور توانائی پیدا کی ہے وہی ان کی شاعری میں خاصہ کی چیز ہے۔ ان کے یہاں نرمی، معصومیت اور سپردگی نام کو بھی نظر نہ آئے گا۔ لکھتے ہیں۔

سنتے نہیں پھر ہم جو بگڑ جاتے ہیں
دشمن ہو کر دوست، سب سے لڑ جاتے ہیں
ملنے کے نہیں اپنی جگہ سے کبھی یاس
ہٹتے نہیں جب بات پر اڑ جاتے ہیں

یاس کی پوری زندگی اپنی اس رباعی کی تفسیر تھی، ان کا بس چلتا تو شاید وہ مرنے سے بھی انکار کر دیتے یہی سرکشی یاس کی شاعری کا بنیادی پتھر ہے۔

یگانہ بہرحال ایک قادر الکلام شاعر اور اپنے رنگ کے تنہا شاعر ہیں ان کی شاعری میں جو کس بل، جو توانائی، خود اعتمادی، شادابی اور رجائیت ملتی ہے وہ اردو کے دوسرے شاعر کے یہاں مشکل ہی سے ملے گی۔ باقر مہدی کی اس رائے سے انکار ممکن نہیں۔

"یگانہ آرٹ وہ آئینہ ہے جس میں ایک بلند شخصیت شاعر کی تنہا جدوجہد کی پوری داستان چھپی ہے۔"

اس سلسلے میں مدیر کارواں، کراچی کے ایک ادارتی نوٹ کا اقتباس جو انہوں نے یگانہ کو ایک خط میں لکھا تھا نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے، جس کی صداقت سے انکار ممکن نہیں "جب کبھی صداقت اور اصول پسندی کا ذکر آتا ہے ان (یگانہ) کا نام ذہن میں ضرور آجاتا ہے، اگر نئے ہندستان میں اردو شعر و ادب کو زندہ رکھنا ہے تو ایسے شعرا پر کام کرنے کی ضرورت ہے جن کے یہاں توانائی، خود اعتمادی، شادابی اور رجائیت ملتی ہے۔"

★★★

مضمون

کامیو کی کہانیاں

ایک مطالعہ

ناصر بغدادی

Sh. Nasir Baghdadi

E-2, 8/14, Maymar Square,
Gulshan - e - Eqbal, Block - 14
Karachi - 74800 (Pakistan)

۱۹۵۷ء میں جب البرٹ کامیو کو ادب کا نوبل انعام ملا تو وہ اپنے شہرت یافتہ معاصرین کے مقابلے میں کافی کم عمر تھا۔ نوبل انعام ملنے کی غیر متوقع خبر سے اس کے بہت سارے ناقدین کی آنکھیں حیرت و استعجاب کی زیادتی سے پھیل گئیں۔ ان میں سے بعض نے سویڈن کی نوبل اکیڈمی کو اپنی سخت گیر تنقید کا ہدف بنایا مگر اس کے ادبی مخالفین میں چند ایسے بھی فراخ دل، کشادہ ذہن رکھنے والے تھے جنہوں نے البرٹ کامیو کو اس گراں مایہ ادبی ایوارڈ کا حقیقی مستحق سمجھا اور کھل کر اس کے ادبی کارناموں کو سراہا اور بخل سے کام نہیں لیا۔

اس بات سے بہر حال انکار کی گنجائش نہیں کہ ادب اور فلسفہ کا ایک قد آور نابغہ روزگار ہونے کے باوصف کامیو اپنے ادبی معتقدات اور فلسفیانہ مبادیات کی بنیادی جہتیں متعین نہ کر سکا تھا۔ اس کے تینوں ناولوں میں (اجنبی، طاعون اور پستی) بین الاقوامی ادب کے قاری کو معنیاتی امکانات، استعاراتی اور علامتی پیکروں کا ایک ایسا سجا سجایا مرقع نظر آتا ہے جس میں کرداروں کے عجیب الہیئت طرزِ عمل اور تحیر زا ماحول کے ذریعہ چلتی پھرتی انسانی زندگی کے بوقلموں مظاہر کے بوقلموں پہلوؤں کی چابکدستی سے عکاسی کی گئی ہے۔ ناولوں کے علاوہ اس نے فلسفیانہ مضامین، کہانیاں، ڈرامے اور صحافتی کالم بھی لکھے جن میں معاصر زندگی کی پیچیدگیوں کے مختلف النوع عناصر کو اجاگر کیا۔ اس نے بگڑتی ہوئی انسانی صورتِ حال اور اپنی وضع کردہ اصطلاحات "لایعنیت" اور "بغاوت" میں بھی تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ "بغاوت" کے حوالے سے اس نے "باغی" کے سخت گیر مگر رومانیت سے مملو کردار کا حقیقت پسندانہ انداز میں جائزہ لیا اور بغاوت کو تاریخی تناظر میں پرکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی جڑوں کو عوام الناس کے جذبات و احساسات سے منسلک کیا۔ "متھ آف سسی فس" میں کامیو ماہرانہ مشاق

سے انسانی زندگی کی لایعنی کیفیات کو اجاگر کرتے ہوئے روزمرہ کے مسائل اور غریب البیئت سرگرمیوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس کے خیال میں لایعنیت انسانی زندگی کا مقدر ہے۔ اگر ہم اس سے سمجھوتہ کرلیں تو ہماری کٹھنائیاں کم ہوسکتی ہیں۔ اس کے علی الرغم اگر ہم انسانی صورتِ حال کا منطقی خطوط پر جائزہ لینے کی شعوری کوشش کریں تو ہمارے ذہن کا انتشار بھی دوچند ہوسکتا ہے اور ایسا عمل سر تا سر لاطائل بھی ثابت ہوگا۔ کامیو کے خیال میں ہر انسانی عمل لایعنی صورتِ حال سے شروع ہوتا ہے اور اس کا منتج بھی لایعنی کیفیت پر ہوگا۔ استدلالی بھول بھلیوں میں گم ہونا اور ہر بات، کا منطقی جواز تلاش کرنا لایعنی انسان کی شکست و ریخت، کے عمل کو مہمیز لگا سکتا ہے!!

کامیو نے ادب اور فلسفہ کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس نے متنوع، عصری اور دائم تقاضوں سے ہم آہنگ، موضوعات پر بے باکی سے لکھتے ہوئے قاری کے ذہن اور اس کے خیالات، کو متاثر کیا ہے۔ اس کے ناولوں، ڈراموں، فلسفیانہ مضامین، سیاسی اور اخلاقی پمفلٹوں، اور اس کی کہانیوں میں زندگی سے وضع کردہ زندہ علامتوں کی معنی خیزیت، پوری جزئیات کے ساتھ اجاگر ہے۔ سویڈن کی نوبل اکیڈمی نے اسے عالمی ادب کا وقیع ترین انعام دیتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ اس کی تحریروں کے بین السطور سے جھلکتی ہوئی دیانتداری ہمارے عہد کے انسانی ضمیر سے وابستہ پیچیدگیوں کو نمایاں طور پر پیش کرتی ہے۔ بہرحال ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ کامیو اپنی ناگہانی موت کی وجہ سے اپنے بکھرے ہوئے قیمتی خیالات کو کسی مخصوص حرکی فلسفہ کا مصدر نہ بنا سکا تھا۔ ان معنوں میں اس کے مبادیات، اور معتقدات کی بنیادی جہتیں متعین نہ ہوسکی تھیں!!

کامیو نے اپنی تحریروں میں ان اہمیتوں کے حامل تصورات سے بحث کی ہے جو انسانی زندگیوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر متاثر کرتے ہیں۔ جنگ، جرم و سزا، مذہب، محبت، تنہائی اور موت، جیسے ہمہ گیر موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے اس نے انسانی زندگی سے وابستہ صداقتوں کو منضبط فکر و نظر کے ساتھ پیش کیا ہے اس کے نظریات، اور رجحانات، سے اختلاف تو ممکن ہے مگر یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اس کی تحریریں سنجیدہ علمیت، دیانتداری اور ذمہ داری کی مظہر ہیں! زندگی کے لایعنی پہلوؤں اور ان سے متعلق تضادات کو پیش کرنے کے باوجود اس نے تاریخی تناظر میں زندگی کی قدر و قیمت کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے ایک جگہ کافکا کی ادبی عظمت، کو کامیو نے یوں بیان کیا تھا کہ "اس نے جو کچھ لکھا ہے معنی آفرینی کے اعتبار سے ارفع ہے" ایک قاری یہی بات کامیو کی تحریروں کے مطالعہ کے بعد اس کی بات کہہ سکتا ہے اس کے خیالات کا کینوس زندگی سے کہیں زیادہ وسیع و عریض ہے۔ اس کا ذہن رسا یونانی دیوتاؤں اور آج کے انسان کی مزاجی جبلت میں بہ آسانی مطابقت اور مماثلت تلاش کرسکتا ہے۔ وہ جب ہمارے سامنے معلوم کو نامعلوم، اور نامعلوم کو معلوم بنا کر پیش کرتا ہے تو معلوم اور نامعلوم کا فرق مٹ کر رہ جاتا ہے! "جلاوطنی اور بادشاہت،" (Exile & the

Kingdom) کی کہانیوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کامیو انسان کی انسان پر عائد کردہ قدغنات اور بندشوں کی مذمت کرتا ہے۔ وہ زوال پذیر معاشرے میں بڑھتے ہوئے تشدد کے رجحانات کے ذمہ دار عوامل کی بھی نشاندہی کرتا ہے اس کے خیال میں اخلاق گراوٹ، اور سیاسی دیوالیہ پن کے سبب بیسویں صدی ظلم و استبداد اور جبر و جور کا ایک ایسا بازار بن گیا ہے جس میں انسانی تشخص سے وابستہ طہارتِ نفس اور تزکیۂ باطن قصۂ پارینہ بن چکے ہیں !!

کامیو نفی الحقیقت عدمیت (Nihilism) کا داعی ہے۔ وہ مروجہ منفی اقدار کی شکست و ریخت کے بعد ایسی انسانی قدروں کو معاشرے میں رائج دیکھنا چاہتا ہے جو صحیح معنوں میں انسان کی اپنی روح اور اس کی معاشرتی احتیاجات سے ہم آہنگ ہوں چونکہ وہ استرداد کی روح ہے لہٰذا ایک "باغی" بن کر پیش پا افتادہ اقدار کی نفی اس کے فلسفۂ حیات کا خاصہ ہے۔ البیئر کامیو کی "انکاریت" کی بنیاد پر کٹھن دنیا میں نجات کا حصول ایک بے پایاں دقت طلب بلکہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ اس کے "خامہ لاالعینیت پسند" سے تخلیق پانے والے کہانیوں کے کرداروں کا مقدر نارسائی، خود اذیتی اور محرومی ہے۔ وہ ہجوم کی دنیا میں حقیقی تشخص سے محروم رہتے ہیں اور تنہائی کے عذاب، آگہی کے لمحوں میں جنہی احساسات سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ کامیو نے "باغی" میں ایک جگہ لکھا تھا کہ جو خدا کے وجود سے منکر ہوتے ہیں، یا جو تاریخی شواہد کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے لئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے لئے اپنی زندگیاں ضائع کر دیں جو خود بھرپور زندگی گذارنے کے اہل نہیں ہوتے ۔ دوسرے الفاظ میں انہیں ذلت و رسوائی کی زندگی گذارنے کی سزا ملتی ہے۔ یہی مافی الذہن یہی موضوع بدلتے ہوئے ہیئت و آہنگ، اور بدلتے ہوئے مواد کے ساتھ اس کی تقریباً ہر تصنیف میں موجود ہے۔ اس کی ابتدائی تحریروں میں یہ خیال بتدریج نمو پانے والی بصیرت کے زیر اثر عصری تقاضوں کو کلاسیکی اور اسطوری امیجری کشید کرنے کی کوششوں تک محدود تھا مگر اس کی مؤخر تصانیف میں اس کا نظام فکر فن بے زمانی (Time lessness) کا حامل ہو گیا ہے۔ بالخصوص اس کے شہرۂ آفاق ناول "بستی" اور اس کی چھ کہانیوں کے مجموعہ "جلاوطنی اور بادشاہت" میں اس نے آفاقی رجحانات، کو لاالعینیت، کے تناظر میں علامتی امکانات و استعاراتی اسلوب نگارش سے مرصع کرکے پیش کیا ہے !!

کامیو کی کہانیوں کے اس مجموعہ میں انسانی لاالعینیت کے پس منظر میں انسانی جذبات، و احساسات کی شدت اور مشاہدات، کی گہرائی و گیرائی کے عناصر نقطۂ کلائمکس پر نظر آتے ہیں۔ وہ کرداروں کے طرز عمل اور ان کی روزمرہ کی سرگرمیوں کے ذریعہ چلتی پھرتی زندگی کے انعکاس کو پیش کرتا ہے۔ اردو کے تجریدی افسانوں کے علی الرغم ان کہانیوں میں جو علامتیں استعمال کی گئی ہیں وہ تہہ داری، تنوع اور بوقلموں معنویت کے باوصف مطالب

اور فہم کے اعتبار سے غیر واضح نہیں۔ لفظی تمثال گری، تشبیہات اور تہہ دار استعارات کے ذریعہ انسانی مسائل کی پیچیدگی اور مربوط فکر و نظر کو پیش کیا گیا ہے۔ کامیو کی کہانیوں میں پیرایۂ اظہار اور تصورِ ابلاغ کو منضبط معنیاتی رجحان دیا گیا ہے۔ ان کہانیوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں انسانی زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں کی ترجمانی کی گئی ہے ـــ تنہائی، نارسائی، معلوم و نامعلوم کا خوف، انسانی اقدار کا باہمی تصادم، ماورائیت، اور غیر ماورائیت، تشکیک، اور عصری حسیت کے تقاضوں کے حوالے سے بہت سارے ژولیدہ مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ کافکا کی طرح کامیو کی کہانیوں میں بھی علامتوں کی معنی خیزیت موجود ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کامیو کافکا کی تحریروں سے بے حد متاثر تھا کیوں کہ اس کی علامتوں کی طرح کامیو کی وضع کردہ علامتیں بھی پیرایۂ اظہار کے اعتبار سے چیستاں نہیں کہ قاری کہانی کو درمیان میں چھوڑنے پر مجبور ہو جائے بعض جگہوں پر کامیو کا توانا علامتی انداز فن پارے کے حسن اور تاثر کو دوچند کر دیتا ہے۔!!

مجموعہ کی پہلی کہانی "بدکار عورت" (The Adulterous women)

فن کی رمزیت، اور ندرتِ خیال کے اعتبار سے ایک شاہکار کہانی ہے۔ اس کہانی میں علامتوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ کامیو ایک عورت کے ذہنی رویئے اور اس کے محسوس و غیر محسوس جذبات کی ترجمانی ماہرانہ چابکدستی سے کرتا ہے۔ اس کہانی کی ہیروئن ژانین (Janine) ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے۔ ایک مرتبہ اسے اپنے بے التفات، مگر آسودہ حال سیلزمین شوہر کے ہمرکاب، بزنس ٹرپ پر شمالی افریقہ جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ پہلی بار مقامی عرب آبادی کی پریشان حال زندگیوں کا مشاہدہ اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے لق و دق اور بے برگ و بار ریگستان کا نظارہ اسے یہ احساس دلاتا ہے کہ خود اس کی زندگی بنجر اور بے ثمر ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے ایک وسیع و عریض ریگستان اس کے اندر بانہیں پھیلاتا جا رہا ہو۔ ژانین کو یہ علاقہ بڑا اجنبی اور پراسرار معلوم ہو رہا تھا جیسے وہاں سے لوگوں کا ناداری، بے بضاعتی اور افسردگی کی چادر اوڑھ کر گذرنے کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے تا حال جاری و ساری تھا۔ لوگوں کی افسردہ خاطری باتمکنت، اور باوقار تھی کہ وہ آزاد فضاؤں میں سانس لے رہے تھے اور انہیں کسی کی غلامی قبول نہ تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہی وہ بادشاہت تھی، یہی وہ سلطنت تھی جو کاتبِ تقدیر کی طرف سے اس کے مقدر میں نوشتہ تو تھی مگر حجاب، خارجی جبریت، کی بنا پر اس کے لئے ناممکن الحصول ہو گئی تھی! ـــ اپنی لایعنی زندگی کی بیکرانی سے فرار حاصل کرنے کے لئے وہ ایک رات، ریگستان کے قلمرو میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ شہر پناہ کی فصیل کے قریب جاتی ہے جس کے ارد گرد ریگستان دور دور تک ہالے کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ اسے مطلق العنان مگر پراسرار ریگستان میں آزادانہ سانس لینے کا تجربہ ناقابلِ بیان جنسی تلذذ کے احساسات سے ہمکنار کرتا ہے۔ جنس خواہش کی

تکمیل کے لئے وہ برسوں اپنے بستر پر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی رہی تھی جسے وہ خواہش آج پوری ہو گئی تھی جیسے اس خواب کی تعبیر اس کے سامنے آگئی تھی۔ اچانک، اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے سامنے پھیلے ہوئے ریگستان اور ان کی ذات کے ریگستان میں بُعد القطبین ہے۔ ایک خود مختار اور بیکراں ہے تو دوسرا محدود اور مجبورِ محض ہے۔ وہ خود اذیتی کے رِستے ہوئے ناسور کو ساتھ لئے اپنی مجبوری پر آنسو بہاتی ہوئی واپس ہوٹل آجاتی ہے۔ یہاں ایک کمرے میں اس کا بے وقوف شوہر اس کے احساسات سے بے خبر خوابِ خرگوش میں ڈوبا ہوتا ہے۔ فی الاصل یہی شخص اس کی غلامی اور جلا وطنی کی علامت تھا!!

"غدّار" (The Renegade) میں کامیو تنظیم اور سفّاکی کے قابلِ مذمت رویوں کے حوالے سے انسان کے اندر چھپی ہوئی شیطانی قوت کے عناصر کو اجاگر کرتا ہے۔ اگرچہ اس کہانی میں انسانی زندگی کے متشدّانہ پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے مگر فکری عمق، تہہ دار معنویت، اور دیرپا تاثر کے اعتبار سے یہ ایک خوبصورت کہانی ہے۔ کامیو انسانی ذہن کی گمراہی اور خیر وشر کی غیر مختتم نبرد آزمائی کا تجزیہ فنکارانہ مہارت سے کرتا ہے۔ اس کہانی میں ایک عیسائی پروہت، مذہبی جنوں کے نشے میں سرشار ہو کر نمک کے ایک اجنبی شہر کی راہ لیتا ہے۔ اسے یہ زعم تھا کہ وہ اپنے معتقدات کی طاقت کے بل بوتے پر وہاں کے درندہ صفت، قبائلی بدّوں کی زندگیوں کو یکسر بدل سکتا ہے مگر اس کی توقعات کے برعکس قبائلی بدّو پروہت کو ناقابلِ بیان تشدّد اور بربریت کا ہدف بناتے ہیں، اس کی زبان کاٹ دی جاتی ہے۔ اس کے مذہبی اعتقادات متزلزل ہو جاتے ہیں اور وہ مخبوط الحواسی کے عالم میں قبائلی بدّوں کے حیوانی معتقدات کی پیروی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہانی بیان کرنے والا (Narrator) مونولاگ کی صورت میں اعلان کرتا ہے کہ شیطان ہی مطلق العنان اور طاقتور ترین ہو سکتا ہے۔ شر ہی بے عیب ہے۔ اس کے بعد پیچیدہ حالات کے خطوط پر کہانی آگے بڑھتی ہے اور ایک بالکل ہی غیر متوقع معنوی سطح کی بلندی کو چھو لیتی ہے۔ جب عیسائی پروہت کی ذہنی اور جذباتی کیفیت قبائلی بدّوں کے اعتقادات کے زیر اثر اندوہناکی اور مخبوط الحواسی کے نقطۂ کمال پر پہنچتی ہے تو ایک پراسرار آواز اس کی سماعت سے ٹکراتی ہے۔ کوئی اس سے کہتا ہے کہ اس کی نجات ممکن ہے۔ اسے معافی مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ متنفّر اور شیطانی قوت کے لئے اپنی جان کی قربانی پیش کر دے۔ اس کی حالت مزید ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہو تا کہ کہہ سکتا آیا یہ آواز ذاتِ باری سے متفرع ہوئی ہے یا کسی اور ذریعہ سے اس کی سماعت سے ٹکرائی ہے !!

___ اذیت کوشی اور تشدّد خیزی کے تناظر میں کامیو کی یہ کہانی علامتی پیرایہ اظہار کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، اگرچہ کہانی کی فضا تحیّر زا اور انسانی شقاوت کی کیفیات سے مملو ہے مگر ٹریٹمنٹ کے حسن، واقعات

کے ربط و تسلسل اور علامتی تہہ داری کی بنا پر اس کا شمار زندہ جاوید عالمی کہانیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ آخری حصّے میں جب ایک غلام کے منہ میں نمک بھر دیا جاتا ہے تو اس مخصوص علامت سے نئی معنوی جہتیں متفرع ہوتی ہیں!

متذکرہ بالا دو کہانیوں کے برعکس "مہمان" (The Guest) کا اسلوب اتنا پیچیدہ نہیں، اگر پلاٹ میں الجھاؤ نہیں اور واقعات کا بیان بھی سیدھا سادھا ہے مگر جملوں کے بین السطور میں گہری رمزیت اور اشاریت پائی جاتی ہے۔ کامیو انسانی آزادی کا علمبردار ہے۔ وہ انسان کے ہاتھوں انسان کو قیدی بنانے کے ہر ناجائز عمل کی مذمت کرتا ہے۔ مگر اس کے خیال میں کبھی کبھی ایسے بھی حالات پیدا ہو جاتے ہیں جب انسان اپنی زندگی کو برقرار رکھنے اور اس کے تحفظ کی خاطر آزادی کے مقابلے میں قید و بند کی اذیت کوشیوں کو ترجیح دیتا ہے۔ کامیو کی اس تخلیق میں یہ اچھوتا خیال اہم کرداروں کے غیر متوقع ردِّ عمل کے ذریعہ سامنے آتا ہے۔ اس کہانی کا محلِ وقوع الجزائر کا ایک دور افتادہ حصّہ ہے۔ یہاں ایک اسکول کی بلڈنگ میں ایک نوجوان ٹیچر رہائش پذیر ہے۔ ان دنوں اسکول بند ہے اور اسکول ٹیچر پہاڑوں اور صحراؤں سے گھرے ہوئے اس ویران اور بے آب و گیاہ علاقے میں جلا وطنی کے احساسات کے ساتھ شب و روز گذار رہا ہے ایک دن اسکول بلڈنگ میں دو افراد عارضی قیام کی غرض سے آتے ہیں۔ ان میں ایک فرانسیسی فوج کا سپاہی ہے اور دوسرا اس کا عرب قیدی جو قتل کے سلسلے میں اس کی قید میں ہے۔ چونکہ سپاہی کو دوسرے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی ہدایت کی گئی تھی لہٰذا علاقے کے حکام اسکول ٹیچر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ عرب قیدی کو اپنی نگرانی میں قریب کے ایک گاؤں کے حکام کے حوالے کرے۔ اسکول ٹیچر سخت مخمصے میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اس قیدی کے ارتکاب کردہ گھناؤنے جرم سے پیدا شدہ کریہہ احساسات تھے جن سے اس کے اعصاب منفی طور پر متاثر ہو رہے تھے اور دوسری طرف اس پر عائد شدہ یہ ناخوشگوار ڈیوٹی کہ وہ قیدی کو والوں کے سپرد کرے، حالات نے اسکول ٹیچر کی مرضی کے خلاف ایسا غیر متوقع موڑ اختیار کیا تھا کہ وہ ناپسندیدگی اور بیزاری کے باوجود فرضِ منصبی کی بجا آوری پر مجبور ہو گیا تھا۔ بادلِ نخواستہ وہ قیدی کو لے کر گاؤں کی سمت روانہ ہوتا ہے۔ ایک دوراہے پر پہنچ کر وہ قیدی کو آزاد کر دیتا ہے۔ قیدی کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک آزادی کی جانب جاتا تھا اور دوسرا قید خانہ کی طرف ــــ اسکول ٹیچر حیران و ششدر رہ جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ قیدی اپنی مرضی سے قید خانے کی طرف جانے والی راہ اختیار کرتا ہے۔

ایک اور کہانی "خاموش لوگ" (The Silent men) میں ٹین گردن کی ناکام ہڑتال سے پیدا شدہ صورتِ حال کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہڑتال کی ناکامی کے بعد جب مزدور فیکٹری میں

داخل ہوتے ہیں تو ان کے آجر خیر سگالی کے اظہار کے طور پر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ مگر جوابا کام پر دوبارہ آنے والے مزدور پتھر کے مجسموں کی طرح خاموش رہتے ہیں۔ وہ اپنے آجروں کے تذبذب کے اسباب اور ان کے ارادوں سے بخوبی واقف ہیں مگر احساس محرومی اور ناکامی کے جذبات کی پرورش کے سبب وہ کوئی ایسی بات کرنے سے قاصر ہیں جس سے دونوں متحارب گروپوں کے درمیان کھڑی غلط فہمی اور مخاصمت کی دیوار زمیں بوس ہو سکتی اور باہمی کے مفاہمت کی فضا بحال ہو پاتی!

اس مجموعہ کی صرف ایک کہانی The Artist At Work کا پس منظر فرانسیسی ہے۔ کہانی میں منطقی ربط اور لطیف، پر اسراریت کے ساتھ سنجیدہ طنز کی ہلکی رنگ آمیزی ہے۔ یہاں کامیو عصری صورت حال کے تناظر میں حقائق سے پیدا ہونے والے زندگی کے تضادات، اور انسانی ناآسودگی کے عناصر کو پیش کرتا ہے۔ کہانی کا آرٹسٹ اپنی بے مثال کامیابی سے قبل یہ سمجھتا ہے کہ اس کی کامیابی "ستاروں" کی رہین منت ہوگی۔ جب شہرت اس کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اسے ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس کی ذاتی زندگی کی زرنگار سرگرمیاں بری طرح متاثر ہوتی ہیں۔ اس کا ذہنی سکون تہ و بالا ہو جاتا ہے خارجی عوامل کی خلل اندازی سے فرار حاصل کرنے کے لئے اسے شراب نوشی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بادہ گساری اور پراگندہ ذہنی کے سبب، وہ اپنے اہل خاندان سے بھی بے تعلق ہو جاتا ہے۔ اعصاب شکن حالات کے سبب، وہ اپنا سب کچھ گنوا کر بالآخر ایک چھوٹے کمرے میں عزلت گزیں ہو جاتا ہے۔ کامیابی اور شہرت کے حصول سے بہت پہلے آرٹسٹ نے فن مصوری کا ایک عدیم المثال شاہکار تیار کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا تھا۔ ایک دن جب اس کا ایک دوست اس کے کمرے میں آتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ آرٹسٹ اعصابی اختلال سے نڈھال ہے اور اس کے سامنے خالی کینوس پر صرف ایک ناقابل فہم لفظ لکھا ہے۔ ایک لفظ جس کو Solitary یا Solidary دونوں طرح سے جا سکتا تھا!!

انسان کے اعتقادات، خارجی جبریت اور پس ماندہ طبقے کے افراد سے یک جہتی کے جذبات، کی ترجمانی The Growing Stone میں کی گئی ہے۔ اس کہانی میں کامیو نے علامت کے ابعادی پہلوؤں کو احساس اور مشاہدے سے ممزوج کر کے مجموعی تاثر کو صد رنگ بنا دیا ہے۔ ایک فرانسیسی انجینئر ایک پل کی تعمیر کے سلسلے میں برازیل آتا ہے۔ یہاں اس کی ملاقات جہاز کے ایک مقامی باورچی سے ہوتی ہے۔ یہ جوشیلا مذہبی شخص اپنے معتقدات سے مغلوب ہو کر قسم کھاتا ہے کہ وہ سر پر سو پونڈ وزنی پتھر رکھ کر مذہبی جلوس کے ساتھ آخر تک چلتا رہے گا۔ جلوس سے ایک دن قبل کی تقریبات میں یہ مقامی شخص بے پایاں جذباتی ہو کر بڑی دیر تک علاقائی رقص میں حصہ لیتا ہے اور بعد ازاں تھکن اور اضمحلال کے

سبب اسی بادزن پتھر کے نیچے دب کر مر جاتا ہے۔ انجینئر اس وزنی پتھر کو اٹھا کر مقامی شخص کے جھونپڑے تک آتا ہے اور غریبوں اور بے خانماں افراد سے یک جہتی کے اظہار کے طور پر اس پتھر کو بھڑکتی ہوئی آگ کی نذر کر دیتا ہے۔!! اس کہانی میں کامیو نے ساری دنیا کے محروم انسانوں کے لئے دردمندی اور انسان دوستی کے آفاقی جذبات کا اظہار بڑے مؤثر پیرائے میں کیا ہے!!

"جلاوطنی اور بادشاہت" میں شامل کہانیوں میں کامیو نے لایعنی انسان کی غریب الیتی، زندگی کے تضادات کی کیفیات، خارجی اور داخلی عوامل سے پیدا شدہ مسائل، انسان کی انسان کے ہاتھوں تذلیل و تحقیر تنہائی اور محرومی سے پیدا ہونے والی زندگی کی لایعنیت اور اس نوع کے بہت سارے عناصر کو بھرپور انداز میں اجاگر کیا ہے۔ ان کہانیوں میں بعض مقامات پر ہم حقیقی یا ذہنی جلاوطنی کے احساسات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اپنی گمشدہ بادشاہت کو دوبارہ حاصل کرنے کا آرزومند تھا مگر جسے یہ بھی علم تھا کہ تاریخ کی بدلی ہوئی صورتِ حال اسے ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے گی۔ کامیو فی الاصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ تاریخ جس شخص نے اس کی عزیز ترین چیز چھین لیتی ہے وہ اس کے حقیقی حقدار کو کبھی واپس نہیں ہوتی۔ شاید یہی ہمارا مقدر ہے اور یہی ہماری زندگی کی کہانی بھی۔ چھینا جھپٹی کا یہ کھیل ابتدائے آفرینش سے کھیلا جا رہا ہے اور شاید ابد تک یہ کھیل جاری رہے گا۔ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کے ہاتھ میں جو چیز ہے وہ کسی اور کی ہے اور جو چیز اس کی اپنی تھی اس کو کسی اور نے چھین لیا۔ مزید برآں کامیو اپنے اردگرد کی زندگی کو من وعن بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کماحقہ جانتا ہے کہ انسانی صورتِ حال ناقابلِ بیاں حد تک ناگفتہ بہ ہے وہ صداقت کا متلاشی ہے اور ان عوامل سے بحث کرتا ہے جو انسانی زندگی کی زبوں حالی کے حقیقی ذمہ دار ہیں۔ وہ مسیحائی کا دعویدار نہیں لہٰذا انسانی مسائل کے حل کے لئے وہ کوئی تیر بہدف علاج تجویز نہیں کرتا اور پھر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس قسم کا کوئی علاج بھی موجود نہیں۔ اس نے زندگی کی لایعنیت کے تناظر میں چند بنیادی نوعیت کے سوالات اٹھائے ہیں۔ یہ وہ آفاقی سوالات ہیں جن میں انسان اور زندگی سے متعلق ہر چیز کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم ان سوالات کو سمجھنے کی کوشش کریں!!

غزل

وزیر آغا

Wazir Agha
58 -Civil Lines
Sargodha -Pakistan

یاد ہے اپنے بدن کو تنکا تنکا جوڑنا
سرپھری پاگل ہوا کا آشیاں کو توڑنا

آ رہی ہے بطنِ صحرا سے کوئی آواز پھر
اسپِ جاں! آواز کی جانب ذرا رُخ موڑنا

اب کسی سنگِ گراں کی جستجو ہم کو نہیں
آ گیا ہے اب ہمیں دیوار سے سر پھوڑنا

تھک گیا ہوں سنتے سنتے قصۂ شام و سحر
تو سنا اپنی کہانی، یہ کہانی چھوڑنا

عمر کے ان آخری ایّام میں سیکھا تو کیا
آنسوؤں کی ڈور سے ٹوٹے ہوئے پر جوڑنا

غزل

زاہدہ زیدی

"Aabshar" 4, HIG Flats
Sir Sayid Nagar
Aligarh-202002

یہ راہِ سخت یہ دشتِ الم کی پہنائی
قدم قدم پہ ہمیں ڈس رہی ہے تنہائی
کسی سراب کو سمجھے تھے چشمۂ شیریں
فریبِ تشنہ لبی تھا، فتورِ بینائی
امید و بیم کے صحرا میں یہ طویل سفر
تپش یہ سوزِ دروں کی، یہ آبلہ پائی
وہ دوریوں کی چٹانیں، وہ فاصلوں کی سموم
مہیب، گو بختی دشتِ جنوں کی پہنائی
الم کی گرد سے سنولایا منظرِ تخئیل
گماں کی دھند میں لپٹی امید کی کھائی
اداس اداس سے وہ بے نوا در و دیوار
اجاڑ اجاڑ سی وہ محفلِ شناسائی
وہ خالی، خالی فضائیں، وہ سست رو لمحات
خود اپنی تاک میں وہ دردِ نا شناسائی

غزل

عنوان چشتی
A-107, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

ٹھنڈی ٹھنڈی آگ میں جلنا اچھا لگتا ہے
اپنے ہی سائے میں پگھلنا اچھا لگتا ہے
اپنے گھر کے پیارے رشتے ہنستے ہیں
بوڑھوں کا بچوں سے بہلنا اچھا لگتا ہے
سناٹا ہی سناٹا ہے چاروں اور
اپنے ہی پہلو میں مچلنا اچھا لگتا ہے
اس کے نام پہ چلتے رہنا کام مرا
اس کی راہ میں گر کے سنبھلنا اچھا لگتا ہے
ان آنکھوں سے پانی برسے ناممکن
پل پل روح کی چادر جلنا اچھا لگتا ہے

عنوان چشتی

جھکی جھکی جو یہ شاخیں سی دل شجر کی ہیں
کرامتیں، یہ تعصب زدہ نظر کی ہیں

کسے بتاؤں کہ کیا جستجو کا حاصل ہے!
جو خوشبوئیں ہیں وہ سب اُس کی رہ گزر کی ہیں

جو کر سکو، کسی افواہ پر یقیں نہ کرو
برائیاں جو یہاں ہیں بری خبر کی ہیں

میں اپنے گھر میں ہوں لیکن معاملہ کیا ہے؟
علامتیں مرے چہرے پہ سب سفر کی ہیں

محاذِ جنگ پہ ہتھیار ڈال دیتے ہیں
انہیں خبر ہے کہ کیا صورتیں مفر کی ہیں

بہت سلیقے سے رہتے ہو، کس کے بچے ہو
علامتیں تو میاں سب یہ اپنے گھر کی ہیں

نہ ان میں شہر کی خوشبو، نہ گاؤں کا جادو
کہاں سے آئی ہیں یہ لڑکیاں کدھر کی ہیں

یہ کہا ہے، وہ کہا ہے ہی نہیں
کوئی اس بت سے بڑا ہے ہی نہیں

اس کے برتاؤ کا کیا رنج کروں
آدمی تو وہ بُرا ہے ہی نہیں

اب محبت ہی محبت ہوں میں
دل میں اب خوفِ خدا ہے ہی نہیں

رنج کس بات پہ ان کو پہنچا
میں نے کچھ ایسا کہا ہے ہی نہیں

گو سراپا ہوں تمنّا، لیکن
ہونٹوں پر حرفِ دعا ہے ہی نہیں

سرخ دھبّے ہیں ترے دامن پر
خون ہے، رنگِ حنا ہے ہی نہیں

کس سے امیدِ کرم ہے عنوان
اس کی فطرت میں وفا ہے ہی نہیں

نشتر خانقاہی

Chamunda Road
Moh: Jatan,
Bijnor (U. P.)

سامنے پربت بھی ہیں کچھ لوگ کہتے آئے تھے
ہم تو بس ہموار میدانوں میں بہتے آئے تھے

ابکی بارش کر گئی مسمار تو حیرت ہی کیا
یہ در و دیوار تو برسوں سے ڈھتے آئے تھے

آخر آخراب وہی معیار ٹھہرا زیست کا
لوگ جس انداز کو معیوب کہتے آئے تھے

دیکھتے ہی دیکھتے تاریخ باہر ہو گئے
وہ مکاں جن میں مرے اجداد رہتے آئے تھے

کون جانے کس لئے چولہے کا ایندھن بن گئے
یہ شجر تو موسموں کی مار سہتے آئے تھے

اب کے کیا ادبار آیا خواب تک گہنا گئے
چاند سورج تو ہمیشہ سے ہے گہتے آئے تھے
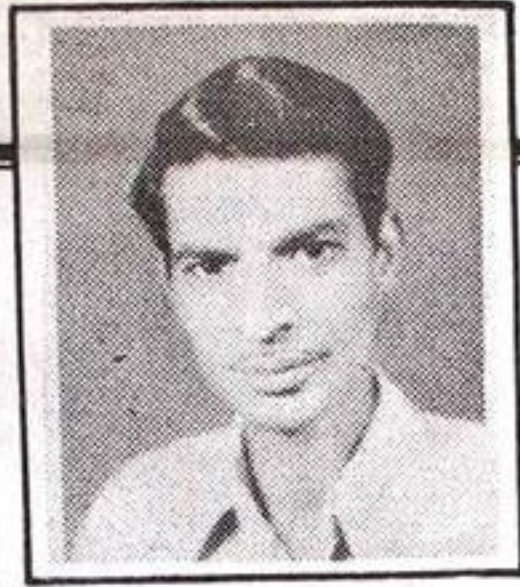
غزل

مدحت الاختر

Naya Godam
Kamti - 441002

میں جدا ہو کے بھی خوش ہوں یہی غم ہے اسکو
ضد ہے ایسی کہ خوشی میری ستم ہے اسکو

ایک لمحے کے لئے خود کو کبھی کھویا تھا
عمر بھر کا سر و سامان بہم ہے اسکو

وہ مجھے اپنا حوالہ تو بنا ہی لے گا
دور رہ کر بھی غنیمت مرا دم ہے اسکو

وہ مجھے بھولنا چاہے بھی تو نا ممکن ہے
یاد جب تک مرا معصوم کرم ہے اسکو

ایک ہی بار یہ کہہ دے کہ برے ہو تم بھی
میری ناکردہ گناہی کی قسم ہے اسکو

میرے معبود! اکیلا تو نہیں ہے مدحت
تیرے ہوتے ہوئے کس بات کا غم ہے اسکو

غزل

رونق نعیم
Jawahar Lal Nehru Road
P.O. Raniganj - 713347 (W.B)

دروازہ مایوس ہے شاید سوگ میں ہے انگنائی بہت
اک مدت پر اپنے گھر کی آئی تو یاد آئی بہت

پورب پچھم اتر دکھن ہر جانب ہے ایک ہی حال
کوئی بھی موسم ہو غم کی چلتی ہے پروائی بہت

اندھے بہرے گونگے سائے خاک مرے کام آئیں گے
آوازوں کے اس جنگل میں ڈستی ہے تنہائی بہت

کہتی ہیں کچھ اور لکیریں نقطوں کا مفہوم ہے اور
چاہے جیسا نقش ہو اس میں ہوتی ہے گہرائی بہت

پیار، شرافت، ہمدردی، ایثار، وفا، سچائی، خلوص
رونق یہ وہ لفظ ہیں جن سے ہوتی ہے رسوائی بہت

رونق نعیم

نہ صبحِ چنگ نہ شامِ رباب میرے لئے
نفس نفس وہی روزِ حساب میرے لئے

میں ریت ریت بگولوں کے اختیار میں ہوں
کہیں سے پھوٹے کوئی موجِ آب میرے لئے

ورق ورق جو نہ پڑھ پاؤں تو شکایت کیا
ہے لمحہ لمحہ مکمل کتاب میرے لئے

اب اس سے میرا تعلق بھی ہے تو بس اتنا
کہ سنگ اس کے لئے عکسِ آب میرے لئے

اب اس نواح میں کیا شہد کی طلب میں کروں
یہاں تو سم بھی نہیں دستیاب میرے لئے

یوں کاروبارِ ہنر سے لگاؤ ہے رونق
کہ جیسے وہ بھی ہے کارِ ثواب میرے لئے

★

نگری نگری پھرتا ہے آوارہ کون
میں اکتارا ہوں تو ہے بنجارہ کون

میرے خوں میں آخر کیسی لذت ہے
اندر اندر لیتا ہے چٹخارہ کون

ساحل ساحل پوچھو لے پنے پانی سے
میں ہوں دریا تو ہے میرا دھارا کون

میں تو کمرے کے باہر اس سوچ میں ہوں
میرے بستر پر ہے پارہ پارہ کون

رونق میرے لفظوں کے پر جلتے ہیں
میرے لب پر رکھتا ہے انگارا کون

غزل

ظہیر غازی پوری

Hashmi colony, Pugmil
Hazaribagh - 825301

اپنے جذبات کی تفصیل ہیں سارے چہرے
آئینہ ہیں تو کبھی جھیل ہیں سارے چہرے

تم کسی عہد میں ڈھونڈو گے تو مل جائیں گے
میرے الفاظ میں تحلیل ہیں سارے چہرے

کون کہتا ہے کہ ہر بات کے عکاس نہیں
شادی و کرب کی ترسیل ہیں سارے چہرے

نفرت و شر سے ہوا کرتی ہے ان کی پہچان
چیختے لمحوں کی تحویل ہیں سارے چہرے

ان سے قائم ہے فضا شعر و ادب کی ہر سو
فکر و اظہار کی زنبیل ہیں سارے چہرے

ان کو تاریخ و تمدن کا وسیلہ کہیئے
حرف و الفاظ کی تکمیل ہیں سارے چہرے

کسی تشریح کی اب کوئی ضرورت ہی نہیں
ہر نئی بات کی تاویل ہیں سارے چہرے

غزل

کرامت علی کرامت

Rahmat Ali building
Diwan Bazar,
Cuttack - 1, Orissa

ہے مرا سازِ یقیں وہم و گماں کا ہم سفر
زندگی کا سانحہ ہے داستاں کا ہم سفر

دور سے دیتے رہے ہیں سب دلاسہ ہر گھڑی
کون ہوتا ہے مرے دردِ نہاں کا ہم سفر

پار کرنی ہیں مجھے آکاش گنگا کی حدیں
بن گیا میرا تخیل آسماں کا ہم سفر

اونٹ کے بچے کی صورت ماں کے پیچھے ہے رواں
میرا سایہ بن گیا ہے کارواں کا ہم سفر

جوت میں نے دل کے داغوں سے جلائی اس طرح
آس کا دیپک بنا ہے کہکشاں کا ہم سفر

یہ نتیجہ ہے مکاں سے لامکاں کی جست کا
خود زماں تبھی بن گیا ہے لازماں کا ہم سفر

ذات کی گہرائیوں میں شاعری کی تھی تلاش
بن گیا احساس بحرِ بے کراں کا ہم سفر

بن کے خود قوسِ قزح رنگوں کو بھر لوں جیب میں
خواب میرا کیوں نہ ہو رنگیں سماں کا ہم سفر

میری آوارہ مزاجی پر صبا تھی خندہ زن
جب گلِ تخلیق تھا برگِ خزاں کا ہم سفر

گو نشاں سب میں ہے اس کا، پر وہ خود ہے بے نشاں
لفظ کیسے ہو نشانِ بے نشاں کا ہم سفر

یوں کرامت جی رہا ہے یادِ ماضی کو لئے
سایۂ بچپن کا ہو جیسے سائباں کا ہم سفر

غزل

Sh. Shuja Khawar

شجاع خاور
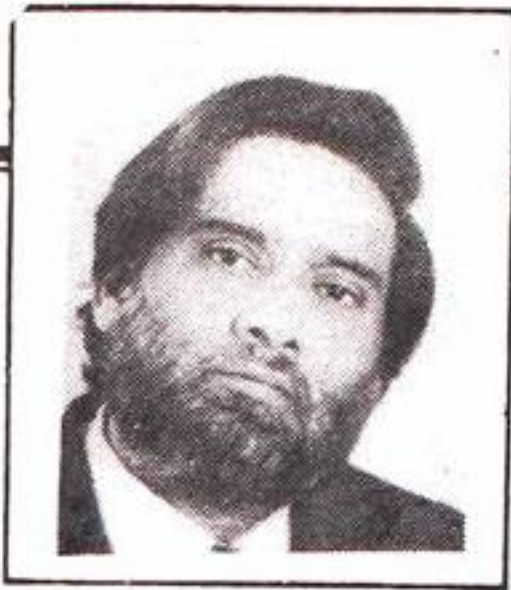
1, Park Lane,
Talkatora Park,
New Delhi - 110 001

فراق میں جو پڑھوں وہ ہے اک عذاب کتاب
دکھائی دیتا ہے چہرہ وہی کتاب کتاب

رفاقتوں کے زمانے میں کون لکھتا ہے
بچھڑ کے تجھ سے لکھی میں نے لاجواب کتاب

ملے کتاب میں خط ایک ہم جماعت کے
میں شرمسار ہوا اور آب آب کتاب

کبھی کتاب سے ہوتا تھا فیض قاری کو
پر اب تو قاری سے ہوتی ہے فیضیاب کتاب

تو وعدے کرتا جا اور میں یقین کرتا جاؤں
کبھی ملیں گے تو ہو جائے گا حساب کتاب

وہ دن کی دھوپ میں بالکل پڑھی نہیں جاتی
جو مجھ کو روز پڑھاتا ہے ماہتاب کتاب

شجاعؔ بس یہی آثار ہیں قیامت کے
جمالیات پہ لکھنے لگے قصاب کتاب

ظفر صہبائی

Soofia House, Motia Park
Bhopal - 462001

ڈروں کی دہشتوں کی یہ صدی حصّے میں آئی ہے
میں جینا چاہتا ہوں خودکشی حصّے میں آئی ہے

چھلک کر آنکھ سے نم کر گئی ہے میرے دامن کو
کبھی جو اتفاقاً بھی خوشی حصّے میں آئی ہے

ہمارے کب ہیں جگمگ کوچہ و بازار اس کے ہیں
یہاں تو غم کی اک اندھی گلی حصّے میں آئی ہے

لکھا تھا دھوپ سے میرا مقدر لکھنے والے نے
تری قربت سے تھوڑی چاندنی حصّے میں آئی ہے

اجازت ہے ہمیں ہنسنے کی لیکن ہنس نہیں سکتے
جو ہونٹوں کو جلا دے وہ ہنسی حصّے میں آئی ہے

ندی، دریا، سمندر مسترد یوں کر دیئے ہم نے
لہو سے بجھنے والی تشنگی حصّے میں آئی ہے

ظفر صہبائی

مٹی نے زرخیزی کو نم ہو کر جانا
یہ آنسو نایاب ہیں کتنے رو کر جانا
عمر ابھی تک اوس میں بھیگ کے کاٹی ہے
آنا تو اے دھوپ ادھر سے ہو کر جانا
یہ پھولوں نے بویا تھا سبزہ تم نے پایا
تم بھی اپنی کوئی روایت بو کر جانا
تجھ کو ہی سوچوں میں تیرے آنے تک
چنتاؤں میں دل کو خوب ڈبو کر جانا
خالی پن دوزخ سے بڑھ کر دوزخ ہے
یہ سچ ہم نے اپنے آپ کو کھو کر جانا

سبزہ سے سب دشت بھرے ہیں تال بھرے ہیں پانی سے
میرے اندر خالی پن ہے کس کی بے ایمانی سے
اب کے اپنی چھت بھی کھلی ہے دیواروں میں در ہیں بہت
بارش دھوپ ہوا جو چاہے آ جائے آسانی سے
سچائی ہمدردی یاری یوں ہم میں سے چلی گئی
جیسے خود کردار خفا ہو جائیں کسی کہانی سے
چہرے پر جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ سب ایک حقیقت ہے
آئینہ کیا دیکھ رہے ہو تم اتنی حیرانی سے
تقریریں دیتی ہیں دلاسے یا نفرت پھیلاتی ہیں
قومیں اور تاریخیں لیکن بنتی ہیں قربانی سے
خون کے رشتے خون میں ڈوبے ایک زمیں کے ٹکڑے پر
صدیوں کا اپنا پن بھولے ہم کتنی آسانی سے

غزل

محبوب راہی

G.N. A. Art's & Commerce College
Barshi Takli, Distt : Akola - 444401 (M.S

کچھ تعلق تو ہے آخر اس سے کچھ رشتہ تو ہے
لاکھ دشمن ہی سہی میرا کوئی لگتا تو ہے

اس نے آکر ذہن میں جگنو سے کچھ چمکا دیئے
ایسے لگتا ہے اسے پہلے کہیں دیکھا تو ہے

رکھ دیئے تھے گھر کے سارے بھید اس پر کھول کر
میں نے سوچا تھا" وہ میرا اپنا ہمسایہ تو ہے"

انکشافِ حق بھی اک فطری تقاضا ہے مگر
"دل کے بہلانے کو غالب کا خیال اچھا تو ہے"

دل اگر لگ جائے تو ہیں دشت و بن شہرِ طرب
ورنہ ہر آبادی اک جنگل تو ہے، صحرا تو ہے

ہر زمیں پامال راہی، ہر خیال افتادہ پا
ہر غزل میں مجھکو تاہم کچھ نیا کہنا تو ہے

غزل

ناظم سلطانپوری

18/1, M. M. Ali Road
Calcutta - 23

اس کی یادوں کے اڑاتے رہے جگنو ہم بھی
پھر وہ دن آیا کہ روشن ہوئے ہر سو ہم بھی

بات کہنے کی نہیں دوست مگر کیا کیجے
عمر بھر چنتے رہے درد کے آنسو ہم بھی

تجھکو سمجھاتے ہیں یہ بات الگ ہے ورنہ
دلِ کمبخت پہ رکھتے نہ تھے قابو ہم بھی

جب ترے شہر میں تھا پیار کی بولی کا چلن
اپنے لہجے کے جگاتے رہے جادو ہم بھی

کھل گیا بوند بھر اس گھر میں اجالا تجھکو
یاد رکھیں گے ترے ظلم کا پہلو ہم بھی

اسنے چاہا تو پھر ایوانِ سخن میں ناظمؔ
چھوڑ جائیں گے غزل سی کوئی خوشبو ہم بھی

غزل

شاہد ماہلی

K -20 C, Sheikh Sarai
Phase II, Delhi - 110 017

حصارِ خود نگراں سے نکل کے دیکھتے ہیں
پھر آج کوچۂ جاناں میں چل کے دیکھتے ہیں

رکے رکے سے شب و روز منجمد لمحے
بساطِ زیست کے مہرے بدل کے دیکھتے ہیں

خود اپنے آپ درِ عافیت کبھی وا ہوگا
ہم آج اہلِ زیاں خواب کل کے دیکھتے ہیں

نئی تلاش کے سانچوں میں ٹوٹ پھوٹ گئے
ذرا اصول و ضوابط میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

بھٹک چکے ہیں بہت کوہ و دشت میں شاہد
پھر اپنے گوشۂ عزلت میں چل کے دیکھتے ہیں

شاہد ماہلی

صدائے دل ہے کدھر ہم کدھر کو دیکھتے ہیں
کس احتیاط سے اہلِ نظر کو دیکھتے ہیں
کہاں تلاش کریں کھوئی منزلوں کا پتہ
نہ جانے کب سے ہر اک رہگذر کو دیکھتے ہیں
یہ درد وہ ہے کہ جس کا نہیں ہے کوئی علاج
یہ کس امید پہ ہم چارہ گر کو دیکھتے ہیں
اداس اداس سا منظر کبھی کبھی سی فضا
کبھی سفر کبھی زادِ سفر کو دیکھتے ہیں
یہیں کہیں پہ امیدوں کا آشیانہ تھا
ہر ایک سبزہ و گل، ہر شجر کو دیکھتے ہیں
ہماری خود نظری کھو گئی کہاں شاہد
قدم قدم پہ ہر اک راہبر کو دیکھتے ہیں

بے انتہا تھا ظرف، آہ بے سبب نہ تھی
آیا تھا سر اٹھا کے کہ کوئی طلب نہ تھی
یہ اور بات ہے کہ کبھی زیرِ لب نہ تھی
دل میں دبی سی حسرتِ دیدار کب نہ تھی
کب دل میں تیری یاد کی شمعیں جلی نہ تھیں
سب کچھ بجھا بجھا تھا تری یاد جب نہ تھی
شامِ الم نہ ہو کہ کبھی صبحِ غم نہ ہو
خوابوں کے درمیان کوئی ایسی شب نہ تھی
شاہد غمِ حیات تھا، زلفیں تھیں، نیند تھی
برسوں یہ آزمائشِ شعر و ادب نہ تھی

غزل

احتشام اختر
Purana Khazana House
Civil Lines - Kota - 324001

گماں کی طرح یقیں بن کے مجھ پہ چھا نہ سکا
وہ شخص آگ تھا لیکن مجھے جلا نہ سکا

ہوا کے دوش پہ اڑتا رہا ہوں یوں تو سدا
حصارِ ذات سے آگے مگر میں جا نہ سکا

فضائے دشت پہ میں آگ بن کے چھا جاتا
میں چوب خشک تھا پھر بھی کوئی جلا نہ سکا

اسے یقیں ہے کہ میں جھک کے چومتا ہوں زمیں
پہاڑ میری بلندی کا راز پا نہ سکا

مکانِ دل میں لگی تھی کچھ آگ ہی ایسی
کہ سامنے تھے سبھی اور کوئی بجھا نہ سکا

مرے نقوش تھے زینت سبھی گھروں کی مگر
عجیب بات ہے میں اپنا گھر سجا نہ سکا

غزل

تاج پیامی
Darul Adab
Maha Deva Mohallah
Ara - Bihar

گزر کے دشتِ بلا سے جو رات آئے گی
پلک پلک پہ ستاروں کے ساتھ آئے گی

ستم کی شرم سے آنکھیں جھکی جھکی ہونگی
تمہارے سامنے وہ واردات آئے گی

اندھیری رات کی تنہائی سے شکایت کیا
کسی کی یادوں کی لے کر برات آئے گی

"رسید مژدہ کہ ایّام غم نہ خواہد ماند"
اداس لب پہ خوشی کی کبھی بات آئے گی

نشاطِ کار کی خاطر مزہ ہے مرنے میں
حیات کرنے کو پھر اک حیات آئے گی

تری نظر ہو اگر زندہ، تاج تو اک دن
سمٹ کے مٹھی میں یہ کائنات آئے گی

کامل اختر

13, Rifle Range Road
Calcutta - 700019

رستہ ہے اگر بند نئی راہ نکالو
دیوار میں روزن کرو، دروازہ بنالو

پھر غار سے نکلا ہے کوئی خون میں لت پت
پتھر نہ سہی تھوڑی سی آواز اچھالو

پرچھائیں سے ڈر جاؤ گے پیکر تو الگ ہے
جسموں کی فصیلوں کو ذرا اور اٹھالو

صحرا سے گذر آئے ہو مانا کہ سلامت
یہ شہر تو دلدل ہے یہاں پاؤں سنبھالو

ہم عکس ہیں گذری ہوئی دلدار رتوں کے
کچھ دیر چمکنے دو ابھی خاک نہ ڈالو

تھوڑا سا سفر اور ہے پھر ایک سمندر
دریا ہے ابھی تیز مرے شہر کے نالو

ویران سہی اتنا بھی ویران نہیں ہے
لپٹو نہ بدن سے در و دیوار کے جالو

اندر کی زمینیں کبھی بنجر نہیں ہوتیں
دو چار شجر خواب کے جب چاہو اگالو

کامل اختر

★

مرے اندر کا صحرا بولتا ہے
کہ سناٹا بھی اونچا بولتا ہے

پرانے لفظ کے معنیٰ نئے ہیں
نیا لہجہ انوکھا بولتا ہے

مرے پیچھے ہے ویرانی کا موسم
ہوا کا سبز جھونکا بولتا ہے

اگر وہ چپ بھی ہو جائے تو اس کے
بدن کا ہر علاقہ بولتا ہے

کسی کو دھیان سے سنتے تو ہو تم
کوئی تو ہے جو اچھا بولتا ہے

شہادت چاہیئے اب بھی اگرچہ
لہو کا قطرہ قطرہ بولتا ہے

مرے ویران سناٹوں میں اکثر
کوئی زخمی پرندہ بولتا ہے

اسے اسٹیج پر آنے سے روکو
کہ یہ سالا غضب کا بولتا ہے

★

نئی کروٹ مرے حالات کی تھی
عجب لہجے میں اس نے بات کی تھی

اشارے ٹہنیوں سے ہو رہے تھے
یہاں مجبوری لوٹے ہات کی تھی

در و دیوار میں سرگوشیاں تھیں
کہ سناٹوں نے مجھ سے بات کی تھی

اثر دونوں کا یکساں تھا بدن پر
ہوا بھی پانیوں کی ذات کی تھی

اسی نے تاک کر موقع نکالا
اسی نے پہلے ہم سے بات کی تھی

جہاں سے لوٹنا ممکن نہیں تھا
اسی جنگل میں ہم نے رات کی تھی

بدن کیوں صبح تک بھیگا ہوا تھا
عنایت کون سی برسات کی تھی

رئیس الدین رئیس

10/1725, Delhi Gate,
Aligarh - 202001 (U. P.)

ورق ورق تجھے تحریر کرتا رہتا ہوں
میں زندگی تری تشہیر کرتا رہتا ہوں

بہت عزیز ہے مجھکو مسافتوں کی تھکن
سفر کو پاؤں کی زنجیر کرتا رہتا ہوں

سپر بناتا ہوں لفظوں کو شعر میں لیکن
قلم کو اپنے میں شمشیر کرتا رہتا ہوں

ہزار عیب خود اپنے ہی نام میں لکھ کر
میں تیری رائے ہمہ گیر کرتا رہتا ہوں

وہ میری فکر میں بدلے کا زہر گھولتا ہے
مگر میں زہر کو اکسیر کرتا رہتا ہوں

لکھے ہیں حقّے میں میرے رئیسؔ سنّاٹے
نوائے وقت کی تسخیر کرتا رہتا ہوں
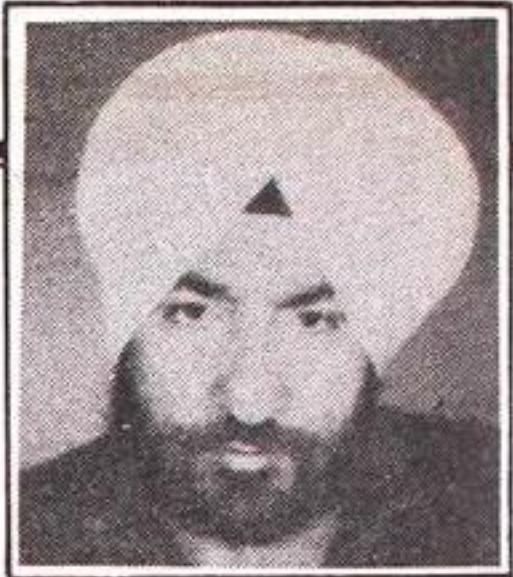
پرتپال سنگھ بیتاب

9-C, Govt. Quarters
Gandhi Nagar
Jammu Tawai - 180004

اونچے اڑنے کا نظّارہ اچھا لگتا ہے
ہوا میں جب تک ہے غبارہ اچھا لگتا ہے

میرے اندھے غار کو روشن رکھا ہے جس نے
میرے دھیان پر اس کا اجارہ اچھا لگتا ہے

میں جب بھی لاکھوں کی اندھی بھیڑ میں ہوتا ہوں
مری جانب اس کا اشارہ اچھا لگتا ہے

کبھی کبھی تاجر بھی پاگل پن کر جاتے ہیں
کبھی کبھی سودے میں خسارہ اچھا لگتا ہے

جلنے کی اچھا ہوتی ہے خوف نہیں ہوتا
اک موسم میں ہر انگارہ اچھا لگتا ہے

پچھلی رات جب آتش دان بھی ٹھنڈے ہوتے ہیں
بچا کھچا ایک آدھ شرارہ اچھا لگتا ہے

غزلیں

پرتپال سنگھ بیتاب

کچھ امید بندھا دے چاہے دھوکہ دے
جینے کا مجھکو بھی ایک بہانہ دے

میں تیروں تو پانی مجھکو گہرا دے
تھک جاؤں تو کوئی سبز جزیرہ دے

بھول بھلیوں میں مجھکو کیوں رکھتا ہے
سفر دیا ہے تو اک سیدھا رستہ دے

عمر سے لمبی ہو گئی یہ تاریک سرنگ
دوسری اور کا اب تو ہمیں اُجالا دے

تاکہ چاند ستارے اس میں باندھ سکوں
میری چادر کائنات پر پھیلا دے

تلخ حقائق سے میں نے منہ موڑ لیا
اب میری آنکھوں کو خواب سنہرا دے

خود سر میں بھی ہوتا جاتا ہوں بے تاب
اک تلوار مرے سر پر بھی لٹکا دے

ایک ایک لفظ مجھکو فضیلت مآب دے
ہر باب ہو نیا کوئی ایسی کتاب دے

میری اذیتوں کا بھی تھوڑا خیال کر
اپنے عتاب کا بھی کبھی کچھ حساب دے

بچپن سے مجھکو سیدھا ضعیفی میں مت اتار
میرے نصیب کا مجھے عہدِ شباب دے

یخ بستگی محیط ہے فکر و شعور پر
ان برف موسموں کو کوئی آفتاب دے

کر موج موج زیر و زبر مجھکو ایک بار
غافل ہوں تہہ بہ تہہ مجھے کچھ اضطراب دے

کرتا ہے کر مچھیرے کو تو جال بھی عطا
مچھلی کو بھی نگاہ مگر زیرِ آب دے

غزل

نذیر فتح پوری

Editor 'Asbaq'
3/21, Neta Park, Yeroda, PoonA - 411006

مٹی میں جو خواب چھپا تھا
وہ خود سونے کی کایا تھا

خود سے جو میں بچ گذرا تھا
نیزہ و سر میں فرق پڑا تھا

ایسی بازی سبھی دیکھی تھی
شاہ سے پیادہ جیت گیا تھا

لَے میں تھا اک سوز کا سرگم
گیتوں میں اک درد بسا تھا

دودھ جلی تھی ساری بستی
چھاچھ کا پینا جرم ہوا تھا

نذیر فتح پوری

جنگل میرے گھر اترا تھا
میں بھی کیا قسمت والا تھا

کھیتوں میں لاشیں بوئی تھیں
بستی بستی خوف اگا تھا

کچھ دن یوں بھی زندہ تھے ہم
وہ پیکر تھا میں سایا تھا

میرے روپ انوپ تھے کتنے
میں دریا تھا میں صحرا تھا

پانچویں سمت چلی تھی دنیا
چاردشا میں سناٹا تھا

جس کو تم دریا سمجھے تھے
وہم و سراب کا اک لہرا تھا

زخم کا ٹانکا جب ٹوٹا تھا
رم جھم رم جھم دل برسا تھا

بادل کیا کیا کھل کھیلے تھے
بستی میں دریا ٹھہرا تھا

جس کی خاطر جال بچھے تھے
وہ پنچھی خود پربستہ تھا

نیندوں میں تھیں اجلی پریاں
آنکھوں میں کالا سپنا تھا

گملے میں کچھ پھول کھلے تھے
لان میں موسم سوکھ رہا تھا

سانپوں کی یلغار تھی جس پر
وہ چندن سے مہک اٹھا تھا

غزل
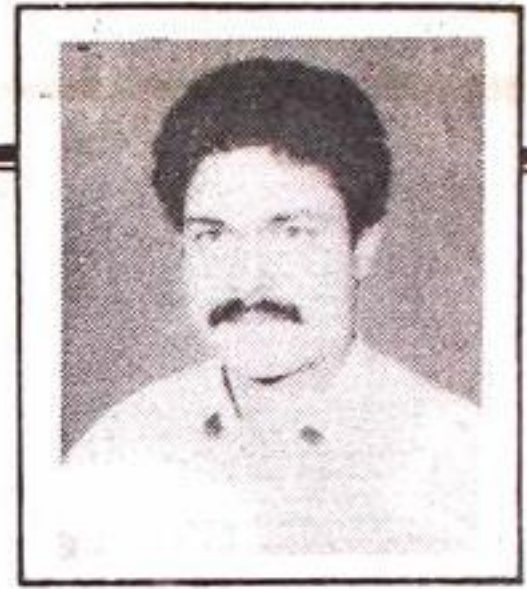
عابر جعفری

10-1235, Radom St,
Pickering - ONT
CANADA - LIW - IJ3

عمر کے لمحوں کے قرضے ہو گئے بے باق کیا
گھٹتے جاتے ہیں کتابِ زیست کے اوراق کیا

بھول بیٹھا ہے دھڑکنا اک ذرا سی بات پر
اس قدر اے دل جدائی ہو گئی ہے شاق کیا

جل بھی جاؤ! اے تمناؤ کبھی بن کر چراغ
اب اندھیرے میں رہیں گے یہ نظر کے طاق کیا

دیکھ لیں ہم نے خزاں میں دامنوں کی دھجیاں
موسمِ گل میں کریں گے دیکھئے عشاق کیا

جب ذرا سی بات سے اپنی نہیں آگاہ ہم
دیکھتے ہیں پھر تجسس سے سوئے آفاق کیا

اس صلیبِ روز و شب پر جس طرح زندہ ہوں میں
مجھ پہ بھی ہوتا ہے عابد زیست کا اطلاق کیا

عابد جعفری

اپنی ہی بینائی گنوا بیٹھو گے رونے سے
کیا حاصل ہے پلکوں میں یوں اشک پرونے سے
بات تو جب ہے لے کے اسے ساحل تک جا پہنچو
دریا کو کیا فرق پڑے گا ناؤ ڈبونے سے
جو ملتا ہے اس کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے
میں ہی بس گھاٹے میں رہا ہوں اپنے ہونے سے
چھوڑ کے میں بھی جاؤں گا اس مٹی پر پہچان
موج امر ہو جاتی ہے ساحل پر کھونے سے
کر کے خوں ارمانوں کا کیوں اشک بہاتے ہو
داغ یہ مٹ سکتا ہی نہیں دامن کو بھگونے سے
تم کو مبارک آب و ہوا ان سائبانوں کی
چاندی جیسی دھوپ ہمیں بہتر ہے سونے سے

کوئی آئے تو تیری یاد کی خوشبو کھو جائے
شب کی آغوش میں جیسے کوئی جگنو کھو جائے
تجھکو ڈھونڈوں اے مرے دل بطریقِ اطفال
آرزو ہے کسی سکے کی طرح تو کھو جائے
جانے کیوں تیز ہواؤں کی دعا مانگتا ہوں
جب بھی وہ چاند سا چہرہ پسِ گیسو کھو جائے
ڈوب جاتا ہے یہ دل سیلِ غمِ فرقت میں
روتے روتے جو کبھی آنکھ سے آنسو کھو جائے
اس طرح میں تری محفل میں ہوا خود فراموش
تشنہ لب جیسے کوئی آ کے لبِ جُو کھو جائے

غزل

فراغ روہوی

67, Maulana Shaukat Ali Street
Calcutta - 700073, West Bengal

ہے دشتِ ہجر کی کیسی یہ گرد آنکھوں میں
کہ صبح و شام ابھرتا ہے درد آنکھوں میں

تمہاری آنکھوں میں یہ رنگ آج کیسا ہے
کہ میرا عکس بھی لگتا ہے زرد، آنکھوں میں

وہ جس کی خوشبو سرِ شام چھو کے گذری تھی
بسا ہوا ہے وہی ایک فرد آنکھوں میں

یہ انکشاف ہوا دیکھ کر تری آنکھیں
کہ پیار ڈھونڈنے نکلا تھا سرد آنکھوں میں

ہوا ہے دور وہ جس دن مری نگاہوں سے
ٹھہر گیا ہے اسی دن سے درد آنکھوں میں

جسے مٹانے سے ہے سیلِ اشک بھی قاصر
جمی ہوئی ہے غموں کی وہ گرد آنکھوں میں

بچھڑتے وقت جو کھل کے فراغ رویا تھا
تمام عمر رہے گا وہ فرد آنکھوں میں

فراغ روہوی

بکھر جائے ہوئے غزل پانیوں پر
یوں لفظوں کے رکھ دو کنول پانیوں پر
قدم جن کے ساحل پہ بھی کانپتے ہیں
وہ کیسے رہیں گے اٹل پانیوں پر
کہیں بھی نہ رکتے تھے جو پاؤں میرے
وہ کیوں ہو گئے آج شل پانیوں پر
مسائل کی لہروں سے الجھا تو میں بھی
نہ نکلا مگر کوئی حل پانیوں پر
خدا جانے کس کی نظر لگ گئی ہے
کہ مرجھا گئے ہیں کنول پانیوں پر
فراغ اس کی بنیاد کمزور ہو گی
جو تعمیر ہو گا محل پانیوں پر

گفتگو میں تلخیوں کا سلسلہ کیسے بڑھا
اس کے میرے درمیاں پھر فاصلہ کیسے بڑھا
چھوڑ آیا تھا جسے تیرے سہارے اے خدا
اس سفینے کی طرف سیلِ بلا کیسے بڑھا
دشتِ حسرت میں چراغ راہ کے ہوتے ہوئے
یک بہ یک ہر سو اندھیرا کیا پتہ کیسے بڑھا
یوں تو امرت کا پیالہ بھی تھا میرے سامنے
زہر نوشی کا مگر یہ حوصلہ کیسے بڑھا
عمر بھر بیساکھیوں سے دور رہ کر بھی فراغ
سوچتا ہوں شہرِ فن میں قدم اکیسے بڑھا

غزل

خورشید طلب
Personnel Section
G.M.Office, Kargali
Bermo - Bokaro - 829104

کوئی شعلہ سا میرے ذہن و دل کے پاس رکھّا تھا
دیارِ فکر میں جھلسا ہوا احساس رکھّا تھا

کہاں تک دیکھتے پیچھے پلٹ کر اپنے گھر کو ہم
ہمارے واسطے ہر گام پر بن واس رکھّا تھا

یہی کہیے عدالت نے اسے نردوش ٹھہرایا
نہیں تو ایک ہنگامہ سرِ اجلاس رکھّا تھا

سیاہی میں لہو کی ہر نئی تحریر ڈوبی تھی
اجالوں سے تہی ہر صفحۂ قرطاس رکھّا تھا

مرے حصّے کی خوشیاں دوستوں کے کام آئیں گی
اسی کوشش میں میں نے خود کو محوِ یاس رکھا تھا

علاوہ خودکشی کے کوئی بھی چارہ نہ تھا پھر بھی
تری بخشی ہوئی نعمت کا میں نے پاس رکھا تھا

ڈبو کے رکھ نہ دے خوش فہمیاں شاداب لمحوں کی
طلبؔ نے اس لئے حصّے میں اپنے پیاس رکھا تھا

غزل

شاھد جمیل

Sub - Registrar
Registration Office
At P. O. - Jokihat,
Araria (Bihar) 854329

خود اپنے خوابوں میں گرتا سنبھلتا رہتا ہوں
میں تیری یاد سے آگے نکلتا رہتا ہوں

وہ میری نیندوں میں اترے تو کیوں نہ تھک جائے
میں اپنے خوابوں کے منظر بدلتا رہتا ہوں

وہ ایک نام جو بے چین کرتا رہتا ہے
اُسی کو سوچ کے اکثر بہلتا رہتا ہوں

میں ڈھونڈ لیتا ہوں ہر بار کوئی اوس کی بوند
پھر اس کی یاد کی بھٹی میں جلتا رہتا ہوں

جو اس کا دل ہے، نہ میری ہوس، فقط اک خواب
اسی کھلونے کی خاطر مچلتا رہتا ہوں

۵ خط

فیض احمد فیض

(۱)

(بنام ڈاکٹر آفتاب احمد خان)

5, Cornwall Avenue
Finchley, London, N3

۱۵ مارچ

پیارے آفتاب، عجیب توارد ہوا بھئی۔ تمہارے پتے کی بہت دنوں سے مجھے بھی تلاش تھی۔ آمنہ بہن سے ایلس کے خطوط میں ایک دوبارہ پچھوایا لیکن ابھی تک جواب برنخاست۔ کل پرسوں رافع کو لکھا کہ رابعہ سے پوچھ کر لکھیں اور آج تمہارا خط آ گیا جس کے معنی ہیں کہ کشف و کرامات کی کچھ رمق ابھی باقی ہے۔

مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آپ لوگ لاس اینجلز سے چلے آئے۔ اور آج کل جیکی کے سایۂ عاطفت میں ہیں، اب کے ملاقات ہو تو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ لاہور آرٹ کونسل میں تشریف لا چکی ہیں۔

اپنا قصہ یوں ہے کہ اب تک بیشتر وقت تو جہاں نوردی میں گزرا، یعنی اگست کے اواخر میں ماسکو سے میں اور سلیمہ یہاں پہنچے اور ستمبر کے اواخر میں کولمبو سے Afro Asian Writers Bureau نے ایک انتظامیہ میٹنگ کے سلسلے میں وہاں بلوایا۔ سوء اتفاق سے مجید بھائی دو تین ہفتے پہلے وہاں سے رخصت ہو چکے تھے ورنہ بہت لطف رہتا۔ خیر میٹنگ بہت بے لطف۔ لیکن لنکا بہت پر فضا چیز تھی دو چار دلچسپ نئے لوگ بھی ملے۔ روسی وفد میں ایک تاشقندی ازبک حمید غلام صاحب تھے بہت خوش طبع

اور خوش رو، وہ کہنے لگے، میاں جلدی کیا ہے۔ بمبئی دہلی ماسکو سے ہوتے ہوئے کیوں نہ جاؤ، اسی ٹکٹ پر ہو سکتا ہے، چنانچہ دو دن بمبئی، تین دن دہلی اور پھر کوئی دو ہفتے ماسکو میں قیام رہا۔ سردار جعفری، ساحر، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور دہلی میں سجاد ظہیر، سومناتھ چپ وغیرہ وغیرہ سے ملاقات رہی۔ ہاں اور راجندر سنگھ نے نیا سکھ لطیفہ سنایا، بھلا تم تک کہاں پہنچا ہوگا۔ وہ یوں کہ ایک سردار صاحب دنیا سے بیزار ہو کر ریلوے لائن پر خودکشی کرنے گئے، کسی راہ گیر نے دیکھا احوال پوچھا۔ سردار جی نے کہا بس اس اندھیر نگری سے جی اچاٹ ہے مرنے جا رہے ہیں۔ راہ گیر نے بہت سمجھانے کی کوشش کی نہیں مانے، پھر اس نے دیکھا کہ سردار جی کے ہاتھ میں ایک پوٹلیا میں کچھ بندھا رکھا ہے، پوچھا یہ کیا ہے، بولے روٹی۔ پوچھا، روٹی کاہے کے لئے؟ سردار جی بولے "لو گڈی لیٹ ہو جائے تے بھکھے مر جائیے"۔

ہاں تو نومبر میں ماسکو سے واپسی ہوئی اور دسمبر کے آخیر میں کیوبا سے ان کے انقلاب کی سالگرہ کی تقریب کی دعوت آگئی، چنانچہ جنوری کا مہینہ کیوبا میں گزرا۔ وہاں کے کوائف لکھنے کے لئے تو پورا دفتر درکار ہے، اس لئے کبھی ملاقات پر سہی، البتہ جاتے اور لوٹتے ہوئے تم دونوں ضرور یاد آئے۔ اگر تمہاری، جیکی کے میاں کچھ معقول آدمی ہوتے تو تم لوگوں سے مل لیتے۔ جب سے یہاں ہوں، کرایہ بچانے کی خاطر گھر تو ضرور خرید لیا ہے لیکن باقی افواہیں یوں ہی ہیں۔ مزید بھائی کے کہنے پر البتہ "جنگ" اخبار کی مراسلہ نویسی ضرور شروع کی تھی لیکن اب اس کام میں بالکل جی نہیں لگتا۔ بلکہ سچ پوچھو تو کسی کام میں ابھی تک نہیں لگا۔ پاکستان اور اردو کے بارے میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن ابھی تک منزل کا راستہ نظر نہیں آیا، خیر دیکھا جائے گا۔

"دستِ تہِ سنگ"، ابھی تک تہ سنگ ہے۔ سبط نے لکھا ہے کہ کتابت ہو چکی ہے۔ کبھی کبھی کوئی پاکستانی رسالہ میں بھی دیکھ لیتا ہوں اور ان کی کیفیت وہی ہے جو تم کہتے ہو لیکن سننے میں آیا ہے کہ ایک آدھ ناول بُرا نہیں۔ میں نے منگوا لئے ہیں اگر کچھ پڑھنے کی چیز ہوئی تو تمہیں بھیج دوں گا۔ اور ہاں بھئی مجھے پاکستانی ادب کا ایک "ٹھیکہ" کہیں سے ملا تھا، یادداشت سے گزشتہ پندرہ برس میں جو کچھ تمہاری نظر میں قابلِ اعتنا ہو تفصیلی طور سے نہیں سرسری طور سے ان کے عنوانات لکھ بھیجو، یعنی جو کچھ بھی ہو تمہیں اچھا لگا ہو، کچھ سہولت ہو جائے گی۔

ایلس نے یہاں ایک اسکول میں ملازمت کر لی ہے، سلیمہ Bath اپنے کالج میں ہے اور منیزہ یہاں گرامر اسکول میں، سب بہت خوش ہیں۔ اپنا یوں ہے کہ کبھی کبھار شکیم شاہد، آل حسن، افضل، اقبال سنگھ وغیرہ سے محفل ہو جاتی ہے۔ لیکن کوئی بیٹھک کی صورت تو ہے نہیں اور نہ محفل کے لئے اہتمام کیا ہے۔ جس کا دماغ نہ کبھی تھا نہ ہے۔ خیر چلتا ہے۔

شمیمہ[12] بیگم کیسی ہیں۔ ہمیں ان کی انگریزی زبان سے کراچی میں ہی ڈر لگتا تھا، اب خدا جانے کون

زبان بولتی ہوں گی۔ وہی حسین بخش دہلی والے کی بات ہے جو ہجرت کر کے لاہور آئے اور کہنے لگے، لائل پور میں دوکان الاٹ ہوئی ہے۔ یہاں تو پنجابی بولتے ہیں، وہاں خدا جانے کیا بولتے ہوں گے۔ بہر حال ہماری دوست ہیں اس لئے بہت سا پیار پہنچا دینا۔

یہاں کوئی ہفتہ بھر پہلے مہینوں کے بعد دھوپ نظر آئی اور اتفاق سے کچھ فردے غزلے کی صورت ہو گئی جو ملفوف ہے۔ نظم کی وجہ نزول یہ سمجھ لو کہ کراچی، بغداد Venezuella اور جانے کہاں کہاں گولی چل رہی ہے۔

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے
ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے
میخانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری سے
تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بے کار جلایا ہمیں روشن نظری نے
یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیض کبھی بخیہ گری نے

ٔ

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر
رہ یقیں تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پرُنم کی آب و تاب کی خیر

رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانتِ غم
نشاطِ ختمِ غمِ کائنات سے پہلے
ہراک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے

٭

سکوں ملے نہ کبھی تیرے پافگاروں کو
جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے
اماں ملے نہ کہیں تیرے جانثاروں کو
جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

فیض

حواشی

۱۔ بیگم مجید ملک۔ ۲۔ رافع الزماں میرے ہم زلف، وہ اور ان کی بیوی رابعہ اس وقت پیرس میں تھے۔ ۳۔ مسز جیکولین کنیڈی۔ ۴۔ فیض صاحب کی بیٹی۔ ۵۔ مجید ملک صاحب جو اس وقت کولمبو پلان کی تنظیم میں محکمۂ اطلاعات کے سربراہ تھے۔ ۶۔ یعنی صدر کنیڈی۔ ۷۔ فیض صاحب کی چھوٹی بیٹی ۸۔ بی بی سی پاکستان سیکشن سے متعلق تھے۔ ۹۔ بی بی سی انڈیا سیکشن سے متعلق تھے۔ ۱۰۔ پہلے ریڈیو پاکستان میں تھے۔ پھر لندن میں چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کرنے گئے اور وہیں بس گئے۔ ۱۱۔ مشہور ہندستانی صحافی اور مصنف فیض کی ادارت کے زمانے میں پاکستان ٹائمز میں بھی مضمون لکھتے تھے۔ اقبال پر ایک نہایت اچھی کتاب The Ardent Pilgrim انگریزی میں لکھی ہے۔ ۱۲۔ میری بیوی

٭

اس خط پر حواشی ڈاکٹر آفتاب احمد خان لکھے ہیں۔ فیض نے اس خط پر تاریخ تو لکھی ہے لیکن سنہ درج نہیں کیا۔ خط میں فیض کی جو شعری تخلیقات شامل ہیں، وہ ۱۹۶۲ء میں لکھی گئی تھیں، اس لئے یہ خط بھی ۱۹۶۲ء ہی میں لکھا گیا ہوگا۔ (ادارہ)

(۲)

(بنام ڈاکٹر محمد حسن)

آفس: ۲۷/بی گلبرگ ۲ لاہور
فون: ۸۳۰۴۸
ریزیڈنس: ۱۰۲-اے ایچ، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
فون: ۳۵۳۴۲۰
مورخہ: ۱۴ ستمبر[1]

مجتبیٰ حسن صاحب۔ تسلیم

آپ کا عنایت نامہ کچھ دن ہوئے ملا تھا۔ مسرت ہوئی۔

دہلی کی راہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں لیکن آپ نے وقت ایسا انتخاب کیا ہے کہ فی الحال تیقن سے کچھ کہنا محال ہے۔ ان دنوں میں ہمارے قومی انتخابات[2] ہو رہے ہیں اور نئی حکومت کی تشکیل وغیرہ کا مرحلہ بھی درپیش ہوگا۔ روانگی کا پروانہ صحیح وقت پر مل سکے گا یا نہیں، کسے معلوم۔ کانگریس[3] میں شرکت یا عدم شرکت سے تو ایسا کچھ فرق نہیں پڑتا۔ غالب خستہ کے بغیر بھی کام چل جائے گا۔ لیکن اگر یونیورسٹی والے کچھ قصہ کرنا چاہتے ہیں تو غیر حاضری نامناسب ہوگی۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ اس تقریب کو فی الحال اور وقت پر اٹھا رکھئے جب اس بارے میں زیادہ اطمینان ہو۔ علی سردار دسمبر کو وہاں آنے کی دعوت دے گئے ہیں شاید وہ زمانہ زیادہ ٹھیک رہے گا۔ آپ کے لئے[5] پاکستانی ادب کے بارے میں کچھ لکھنے کی سعی کروں گا۔

انیس بواسس کو میری دلی تعزیت اور پیار پہنچا دیجئے اور باقی احباب کو دعا و سلام۔

مخلص فیض

حواشی: از ڈاکٹر محمد حسن

[1] "مورخہ" تک کی لیٹر ہیڈ کی عبارت چھپی ہوئی ہے اور انگریزی میں ہے۔

[2] اس وقت غالباً ۱۹۷۷ء کے پاکستان کے قومی انتخابات کا ذکر ہے جن میں دھاندلی کے سلسلے میں پاکستان کے قومی محاذ کی تحریک چلی تھی۔

[3] کانگریس سے مراد افرو ایشیائی ادیبوں کی کانگریس ہے۔

[4] یونیورسٹی سے مراد جواہر لال نہرو یونیورسٹی ہے اس زمانے میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے فیض صاحب کو بلانے اور انہیں آنریری ڈگری دینے کا سوال درپیش تھا۔

[5] میں ان دنوں انڈین کونسل فار سوشل سائنسز ریسرچ کے لئے پاکستان کے اردو ادب پر تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا۔ اس ضمن میں فیض صاحب سے بعض سوالات کئے تھے۔

۶ے انیل بواس ہندستان کے مشہور موسیقار اور میوزک ڈائریکٹر جو ان دنوں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے جزوقتی طور پر وابستہ تھے اور نہرو یونیورسٹی کی کلچرل کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے میں ان سے قریب تھا۔ ان کے عزیز کا انتقال ہوا تھا۔ انیل نے فیض کی سالگرہ پر ان کی غزلیں گائی تھیں۔

(۳)

الکتاب الافریقیوت الاسیویون — چیف ایڈیٹر

لوٹس

پی او بی

۱۳۵/۴۳۰ — جرنل آف افرو۔ ایشین رائٹرز ایسوسی ایشن

بیروت۔ لبنان — (انگلش۔ فرنچ۔ عربک)

ٹیلی فون: ۸۰۰۱۱

۸۰۰۲۱۱ لے

۱۲ مارچ

مجتبیٰ حسن صاحب۔ تسلیم

آپ کا دوسرا خط ملا۔ ہم چند دنوں کے لئے تبدیلی آب و ہوا کی خاطر خلیج یعنی شارجہ، ابو ظہبی چلے گئے تھے۔ کل ہی واپسی ہوئی ہے۔ مارچ کا وسط تو ہو چکا اور اسی ماہ لوٹس کا اگلا شمارہ ترتیب دینا ہے اس لئے یہاں سے جلد نکلنا نہ ہو سکے گا۔ دہلی سے کملیشور صاحب کا خط اور اندر گجرال کے حوالے سے بھیشم ساہنی کا تار ملا ہے، دونوں اپریل کے تیسرے ہفتے میں بلوانا چاہتے ہیں، اس صورت میں شاید شاعرے میں بھی شرکت نہ ہو سکے اور ہم ملاقات اپریل تک ہی اٹھار کھیں۔ اگر رسالے کا کام پہلے ختم ہو گیا تو اس سے پہلے سہی۔ کلکتہ یونیورسٹی والا معاملہ جولائی، اگست ہی میں ٹھیک ہے۔

اپنے گھر کے حالات کافی پریشان کن ہیں۔ نو گرفتاروں میں ہمارے داماد شعیب ہاشمی بھی شامل ہیں جن کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ اپنے ہم بچۂ شتراست والا معاملہ ہے۔ ٹیلی فون پر لاہور میں بچوں میں بات ہو گئی تھی۔ تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ وہ اس افتاد سے بالکل ہراساں نہیں ہیں۔ اور لاہور، راول پنڈی، کراچی وغیرہ میں دوستوں نے ہمارے نام پر جو محفلیں برپا کیں ان سے بھی بہت تقویت ہوئی ہے۔

ضحاک کا ترجمہ مکمل ہو جائے تو بھجوا دیجئے۔ باقی عند الملاقات۔

مخلص

فیض

حواشی
از ڈاکٹر محمد حسن

۱؎ یہ خط غالباً ۱۹۷۸ء یا ۱۹۷۹ء کا ہے جب فیض "لوٹس" کے ایڈیٹر ہو کر بیروت (لبنان) چلے گئے تھے سوائے "الکتاب الافریقیون ......" والی عبارت کے خط کی پیشانی کی ساری مطبوعہ عبارت انگریزی میں ہے۔

۲؎ بھیشم ساہنی ہندی کے مشہور افسانہ نگار، اور نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرز کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے فیض کو مدعو کر رہے تھے۔

۳؎ مشاعرے سے مراد ڈی سی ایم کا مشاعرہ ہے۔

۴؎ کلکتہ یونیورسٹی والے معاملے سے وہاں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے اقبال چیئر پر تقرر کی طرف اشارہ ہے۔

۵؎ گھر سے مراد پاکستان ہے جہاں فیض صاحب کے داماد کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

۶؎ بچۂ شتر است سے سعدی کی گلستان کی حکایت کی طرف اشارہ ہے کہ خرگوش جنگل میں ہراساں تھے سبب پوچھا تو بولے لوگ اونٹ پکڑ رہے ہیں، ہمیں ڈر ہے کہ ہمیں بھی اونٹ کا بچّہ سمجھ کر نہ پکڑ لیں۔

۷؎ محفلوں سے مراد فیض صاحب کی سال گرہ کے موقع پر کراچی کے پریس کلب، لاہور اور اسلام آباد کی تقاریب مراد ہیں جن میں سے کسی ایک تقریب میں احمد فراز نے بھی اپنی مشہور نظم پڑھی تھی۔

۸؎ ضحاک سے مراد اس عنوان کے میرے ڈرامے سے ہے جس کے انگریزی ترجمے کے چھپنے کا معاملہ لندن کے کسی پبلشرز سے طے کرنے کا ذکر تھا۔

(۴)

مجتبیٰ حسن صاحب۔ تسلیم ۱؎

دو ہی دن پہلے آپ کو خط لکھا تھا اور آج آپ کا عنایت نامہ آ گیا جس کا دیر سے انتظار تھا۔ آپ کی افتاد ۲؎ کا صوفیہ میں محمودہ بیگم سے سن لیا تھا۔

آیندہ کا پروگرام فی الحال یوں ہے کہ ۲۰ اکتوبر سے نومبر کے اوائل تک کی دعوت ہے ممکن ہے اس کے بعد ہفتے بھر کے لئے امریکہ جانا ہو۔ نومبر کے آخری ہفتے میں جاپان میں ایک تقریب ہے جس کی ابھی تصدیق نہیں ہوئی، اس کے بعد کوئی اور مصروفیت ابھی تک پیش نظر نہیں اور زاد راہ مہیّا ہو سکے تو دسمبر، جنوری میں آپ کے ہاں حاضری ہو سکتی ہے میعاد آپ طے کر لیجئے لیکن یہاں کے دفتر سے طویل غیر حاضری محال ہے ایک ڈیڑھ ماہ کی گنجائش البتہ نکل سکتی ہے، شرط صرف یہ ہے کہ کچھ ہفتے بیشتر بات پکی

ہو جائے تاکہ ہم کسی اور جانب رخ نہ کریں۔

اپنے بارے میں دہلی کے ایک انگریزی[3] میگزین کے لئے کچھ لکھنے کا وعدہ ہے لیکن ابھی تک طبیعت ادھر نہیں آئی۔ جب کچھ ہو سکا آپ کو نقل بھجوا دوں گا۔ نئے مجموعے کا مسودہ[4] آپ کے لئے سندھو صاحب کے پتے پر بھیجا تھا، آپ تک پہنچا یا نہیں۔

مخلص

فیض

حواشی

از: ڈاکٹر محمد حسن

[1] یہ خط ۱۹۸۰ء کا ہے اور "لوٹس" کے لیٹر ہیڈ پر ہے جس کی پیشانی کی مطبوعہ عبارت خط ۲ کے شروع میں درج کی جا چکی ہے۔

[2] افتاد سے مراد ۱۹۸۰ء کے فرقہ وارانہ فساد میں مراد آباد میں میرے آبائی مکان کے جل جانے اور میرے والد محترم کے زخمی ہونے اور گرفتار ہونے کے حادثے سے ہے۔ دو ہی دن پہلے والے جس خط کا ذکر ہے اس میں تازہ غزل تھی۔ اس واقعے پر میری تالیفِ قلب کے لئے بھیجی تھی۔

[3] میں نے فرمائش کی تھی کہ اپنی شاعری اور اپنے نظریات کے بارے میں ایک مضمون لکھ بھیجیں کہ ان کی آمد کے موقع پر انگریزی اخبارات و رسائل میں چھپے۔ میرے اس سوال نامے کا جواب فیض صاحب نے انگریزی میں خاصی تفصیل سے دیا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

[4] سندھو سے مراد جنار ایکسپورٹ کے کرنل جی ایس سندھو ہیں جن کی بیگم ہندی کے مشہور اشاعت گھر راجکمل پرکاشن کی مالک ہیں۔ مجموعۂ کلام سے مراد ہے "مرے دل مرے مسافر" جس کا ہندی اور اردو روپ راج کمل نے میرے دیباچے کے ساتھ چھاپا ہے۔

(۵)

۳ر اپریل

آپ[1] کا ۳۱ جنوری کا لکھا ہوا خط پانچ سات دن پہلے پاکستان سے واپسی پر ہاتھ لگا۔ اس طویل خاموشی کے لئے معذرت۔

آپ کے خط کے ساتھ ہی جیوتی باسو[2] صاحب اور وائس چانسلر صاحب کے خطوط بھی موصول ہوئے۔ انتہائی تاسف ہے اور ندامت بھی کہ یہ پیشکش اتنی تاخیر سے پہنچی کہ اب اس کرم نوازی سے استفادہ

اپنے بس کی بات نہیں۔ کافی انتظار کے بعد میں نے کچھ اور مصروفیتیں سر لے لی ہیں جن میں یہ پورا سال نکل جائے گا اور اس کے بعد ہم نے، گھر جانا طے کرلیا ہے۔ بیوی تو پہلے ہی جا چکی ہیں اور ساتھ ہی ہمیں الٹی میٹم بھیج دیا ہے کہ انہیں بچوں سے مزید جدائی گوارا نہیں، ہم تو سعادت مند اور اطاعت گزار شوہر ہیں اس لئے مشکل سے پانچ سات ماہ کی چھٹی حاصل کی ہے تاکہ باقی ذمّے داریوں سے نپٹ سکیں۔

جیوتی باسو صاحب اور وائس چانسلر صاحب سے میں نے معذرت تو کرلی ہے لیکن اس کے باوجود کچھ احساسِ گناہ باقی ہے، اگر مجھے وقت پر آپ کے اجلاس[۳] کی اطلاع ہو جاتی تو شاید یہ نوبت پیش نہ آتی، لیکن اب تو سوداؔ[۴] کی زبان میں "جو ہوا سو ہوا"۔ کچھ تلافی یوں ہو سکتی ہے کہ ہم کبھی وقت نکال کر پانچ سات لکچر کلکتے کی نذر کر آئیں۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ ایک نئی غزل بھی سن لیجئے جو پاکستان میں لکھی گئی۔

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسّر تو آرزو ہی سہی
نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی
کسی طرح تو جمے بزم، میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی
گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی
دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیضؔ ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

مخلص فیض

حواشی: از ڈاکٹر محمد حسن ــــــ [۱] یہ خط بھی "لوٹس" کے لیٹر ہیڈ پر ہے۔

[۲] بیروت سے لکھا ہوا یہ خط غالباً ۱۹۸۲ء کا ہے جب کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہو جانے پر فیض صاحب نے معذرت کا خط لکھ دیا تھا۔

[۳] اجلاس سے مراد سلیکشن کمیٹی کے جلسے سے ہے جس کمیٹی کا میں بھی ایک رکن تھا۔

[۴] سوداؔ کی مشہور غزل کی طرف اشارہ ہے۔ "تو اپنے خون کو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا"۔

ایک نظم

ساجدہ زیدی

Gulbarga, Dodhpur
Aligarh - 202001 (U. P.)

جس کی بنیاد پانی پہ رکھی گئی
وہ محل اپنے ہی بوجھ سے دھنس گیا

سارے دیوار و در، خود شناسائی کے
کاخ دکو دردِ دل کی پذیرائی کے
نقش کعبہ تراشی کے، نجم گشتہ سجدوں کی تکمیل کے
سنگریزوں کی مانند
پانی میں دھنسنے لگے
تند موجوں کے سینے میں
لرزاں تلاطم سمٹنے لگا
ایک ملبے کی ڈھیری

تہہِ آب، اپنے بدن کو سمیٹے ہوئے رہ گئی

ساحلِ بحر کی سرمئی ریت پر
بادِ صرصر کی یلغار سے
یوں لہو رنگ نقشِ قدم مٹ گئے
جیسے ـــ ان راستوں پر کبھی،
درد کے رجز قافلوں کی
برف پائی نہ تھی،
سرفروشی نہ تھی

ساجدہ زیدی

جب درد کے ناتے ٹوٹ گئے
جب منظر منظر پھیلے ہوئے
ان دیکھے لمبے ہاتھوں نے
سب عہد پرانے لوٹ لئے
سب دل کے خزانے لوٹ لئے
سب عشق کے دعوے روٹھ گئے
جاں گنگ ہوئی دل چھوٹ گئے
ہر زخم تمنّا راکھ ہوا

جو شعلۂ جاں تھرّاتا ہوا
شفاف اندھیری راتوں میں
رقصاں تھا فلک کے زینے پر
تھک ہار کے آخر بیٹھ رہا
مٹیالے ـــ بے حس ـــ ریتیلے ان رستوں پر

ـــ وہ رستے
جن پر رشتوں کے
روشن چہرے روپوش ہوئے
وہ، جن کے شور شرابے میں
من کی آوازیں ڈوب گئیں
دل کے ہنگامے سرد ہوئے

وہ رستے بھی کیا رستے تھے

ہر چار طرف......
اک دھند کی خاکی چادر تھی
اور اس کے آگے ـــ حدِ نظر تک
پھیلی ہوئی........
بے جاں لفظوں
بے مہر یگوں کی دلدل تھی

وہ شعلۂ رقصاں ـــ حیراں تھا
وہ دیدۂ حیراں ـــ گریاں تھا
وہ ذہن پریشاں ـــ لرزاں تھا
اک دل کا نگر ـــ سو دیراں تھا
اک راہی تھا ـــ جو ان بے مہر فضاؤں میں
عزم پرواز سے
خوئے سفر کی بیتابی سے ـــ ہراساں تھا

کچھ چاند کی مدھم کرنیں تھیں
جو درد کے سارے رازوں سے
واقف تھیں ـــ مگر
ان مٹیالے ـــ بے حس ـــ گدلے رستوں سے
وہ بھی گریزاں تھیں

آرزو

علیم اللہ حالی
White House Compound
Gaya - 823001 (Bihar)

وہاں
جہاں پر
نظر کی سرحد
کسی دھندلکے میں گم ہوئی ہے
جہاں کوئی شئے
وجود کے واہمے کی صورت
نظر نہ آئے
نظر بھی آئے

ہر ایک لمحے
نفس کی مانند ڈوبتے ابھرتے
نفی و اثبات کے تصادم کا وہ ہیولا
جو قیدِ افکار سے گریزاں
مگر ہے احساس کے حصاروں میں
لرزاں لرزاں
مسافتِ فن کی منزلوں میں
وہ اک کرشمہ کبھی کہیں ہو
وہ اپنے اظہار کا امیں ہو
وہ اپنے الفاظ میں مکیں ہو

بے یقینی کے مرحلے میں دو نظمیں

عین تابش
New Karim Ganj
Gaya - 823001

(۱)

میں اک کریہہ سفر کی مسافتوں کے لئے
دیارِ خواب املاک کے چھوڑ آیا ہوں
میں گھر سے نکلا تھا یہ سوچ کر
کہ اک سفر خوش خرام منظرِ امکاں کے نام لکھوں گا
میں اپنے کاسے میں کچھ پھول لے کے نکلا تھا
جو چار سمت سے بدبو کی کاٹ کرتے تھے
میں اپنے سینے پہ کچھ زخم کھا کے اٹھا تھا
جو تیرہ شب میں چراغ وصال بن کے چمکتے
اداس شہر کی دہلیز پر مرے آنسو
گذرتی صدیوں کے خفتہ نصیب پر لکھتے
وہ داستانِ مسلسل جو خفتہ بخت قبیلے کے سر پہ
تاج سجا کر جوان ہو جاتی
میں داستان مسلسل کا اک ادھورا باب
مرا خیال پریشاں مرا جمال خراب
میں اس سفر میں اجڑ کر کبھی نہ بسنے کا
میں ایک ابر جو شاید نہیں برسنے کا
مرے خدا مجھے دنیا کے اس اندھیرے میں
کسی یقین کا کوئی پتہ نہیں ملتا
کسی طرف سے کوئی راستہ نہیں ملتا

عین تابش

(۲)

آپ کو کچھ یاد ہے ؟
اک شہر تھا اونچے پہاڑوں سے گھرا
اس میں محلے تھے کئی
اور ان محلّوں میں بہت سے لوگ ہنستے بولتے تھے
خواہشیں سینوں میں زندہ
خواب آنکھوں میں چمکتے تھے فرشتوں کی طرح
آپ کو کچھ یاد ہے ؟
کچھ گھر تھے کچے پکے، بچوں کی ہنسی سے گونجتے
باغات میں کچھ پھول تھے
جوڑوں میں سجتے تھے سہاگن بیبیوں کے
اور کچھ گلدان میں رکھے ہوئے محصول شام وصل کے
دیوار و در پر رنگ روغن دید کی امید کے
آپ کو کچھ یاد ہے ؟

صبحیں شگفتہ تازہ دم نکھری نہائی جاگتی
ابٹن مسالے سے لدی
گلیوں میں قدموں کی کھنک
سڑکوں پہ رکشا گاڑیوں کی بھیڑ
دوکانوں میں آلو، ہینگ، ہلدی کی مہک
اسکول جاتے بچے بستوں سے لدے
اور دفتروں کو جاتے بابو پرانی کرسیوں پر ڈولتے
نخاس میں عشاق آہیں بھرتے آنسو رولتے
بکھرے ہوئے ملبوں پہ کتنا ڈھونڈتا ہوں
کچھ نظر آتا نہیں ہے!
آپ کو کچھ یاد ہے ؟

نظم
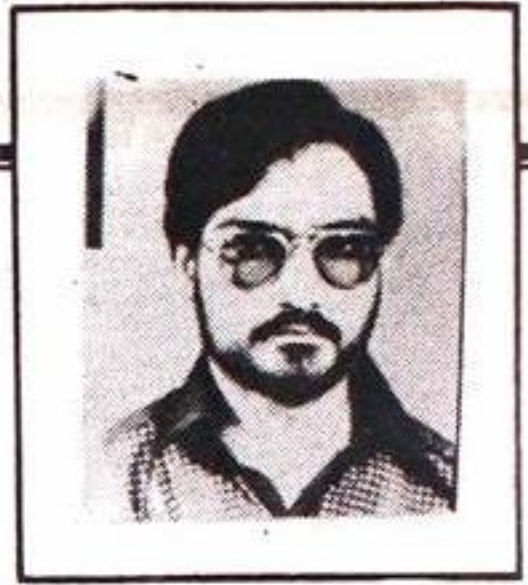
خلا

حیدر قریشی

SUD RING 75
65795 - Hattershiem,
Germany

کبھی تم دل میں بستے تھے
تو آنکھوں میں
کہیں اندر ـــــ
بہاریں مسکراتیں
کہکشائیں رقص کرتی تھیں
زمین و آسماں میں
ایسی یکتائی کا عالم تھا
خلا کیسا؟
کہیں اک درز تک بھی تو
نہیں معلوم ہوتی تھی
مگر پھر یوں ہوا، اک دن
دھماکہ سا ہوا کوئی
زمین و آسماں میں اک دوئی
پیدا ہوئی

پھر فاصلہ در فاصلہ اک سلسلہ بنتا گیا
اور اب یہ عالم ہے
بہاریں کھو چکی ہیں
کہکشائیں بجھ گئی ہیں
اور مری آنکھوں میں اک اندھا خلا ہے
دور تک پھیلا ہوا، جس میں
لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کو سجائے
چپ کھڑی ہے میری تنہائی
اور اس کے گرد اک سفاک سناٹا
مسلسل رقص کرتا ہے!

حیدر قریشی

تیامت[1]

یہ سنتے تھے
سمندر سے نکل کر
وہ کبھی اوپر چلی آتی
تو دھرتی کے مکینوں کے لئے
ویرانیاں بربادیاں لاتی
وہ مظہر تھی ہلاکت اور تباہی کا
سبھی مجبور لوگوں پر ستم ڈھاتی
سبھی مقہور لوگوں سے کراتی
احترام اپنا، وہ جابر
قوت و طاقت پہ نازاں
نشۂ تقدیس میں ڈوبی ہوئی
جب جھومتی جاتی
ہلاکت اور بربادی کے منظر پھیلتے جاتے
یہ سنتے تھے مگر اب دیکھتے بھی ہیں
کئی صدیوں تلک سوئی ہوئی، کھوئی ہوئی
جابر تیامت جاگ اٹھی ہے
ہلاکت خیز قوت اور عظمت کے نشے میں جھومتی
قاہر تیامت ساحلِ مغرب سے نکلی ہے
سمیری سرزمیں کو اب کے اس نے
صرف خشکی اور پانی ہی نہیں
ساری فضا سے، ہر طرف سے، ہر جگہ سے
گھیر رکھا ہے؟

---

[1] TIAMAT (قدیم عراق) سمیری دیومالا کی ایک سمندری بلا
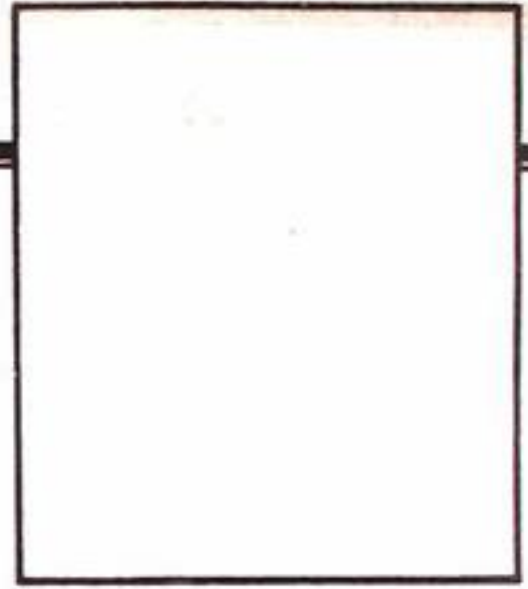
یادوں کے چراغ

مظہر جمیل

Sh. Mazhar Jameel

D-40, Block - H
North Nazim Abad
Karachi - Pakistan

رات اتری ہے تو پھر دل نے کئے ہیں روشن
ان عزیزانِ کم آثار کی یادوں کے چراغ
جس کو برائے ہوئے ایک زمانہ بیتا
عرصۂ عمر میں لوٹا ہے کوئی صبح و شام
کب کسی روزنِ گنبد سے اتر کے آئیں
صبحِ گم گشتہ کی رقصندہ سنہری پریاں
کب کسی شام کی مہکار نے جاتے جاتے
دامنِ یاد کو کھینچا کہ ادھر تو دیکھو!
کنجِ شب ہائے گذشتہ سے بھی جگنو صورت
لمحہ اڑ کر نہ کبھی کوئی ادھر کو آیا

○

بس اسی طور سے گذرے ہیں شب و روز کہ دل
عشرتِ لمحۂ موجود میں سرشار رہا

آئینہ خانۂ احساس کے سب نقش و نگار
ایسے دھندلائے کہ پہچان نہ پایا دل بھی
پہچان نہ پایا دل بھی
جانے کن لوگوں کے انفاسِ تپاں کی خوشبو
قریۂ جاں میں پھری سر بہ گریباں برسوں
جانے کن آنکھوں نے دیکھے تھے وہی خواب کہ جو
کوچہ در کوچہ پھرے ساتھ پریشاں برسوں
حلقہ در حلقہ جو روشن تھیں سرِ بزمِ خیال
مہرباں صورتیں کیا کیا مہ و انجم کی مثال
اب جو پرچھائیاں ہوتی ہیں کبھی محوِ کلام
یاد آتے ہی نہیں دل کو قرینے کہ کسے!
سایۂ شاخِ گل و سرو و سمن ٹھیرائے
پوچھیے کس سے یہ ناسودہ سوالوں کے جواب
کس کو سمجھائے شب و روز کے ملبوں کا حساب
کس کو نادیدہ بہاروں کا چمن ٹھیرائے

ایسی بے نام مسافت کے سرے پر اے دل
گریۂ نیم شبی سے بھی بھلا کیا حاصل

شہناز نبی
28/A, Ripon Lane
Calcutta - 700 016

(۱)

زندگی
سیلن زدہ آنگن کی کائی کھرچنے کا نام ہے
یا پھر
دیمک زدہ دیواروں کے جھڑتے ہوئے پلستر کو
سمیٹنے کا نام
صبح شروع ہوتی ہے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سے
ابھی تو سارا دن باقی ہے
خالی برتنوں کو اناج سے بھرا دیکھنے کی تگ و دو شروع ہوگی
بسیں، ٹرامیں
شانے چھیلنے والی بھیڑ
اوبڑکھابڑ راستوں پر سنبھلتے ہوئے چلنے کی کوشش
زندگی ـــــ
ایک مسلسل جھٹکے کا نام ہے

شہر کی سڑکوں اور خوابوں کی سرزمین میں کیا فرق ہے
دونوں ہی بے تعبیر ہیں
دونوں ہی نٹ کے کھلاڑی کا توازن چاہتی ہیں

میں اور میری بہن
گھر کے اندر اور باہر
دیمک زدہ دیواروں پر پڑی دراڑوں کے ہمسفر ہیں

زندگی
دراڑوں کو جوڑنے کا نام کیوں نہیں ہے

شہناز نبی

(۲)

ٹوٹی ہوئی چوڑیوں سے زنجیر بنانا
ایک عجیب سا کھیل تھا بچپن کا
رنگ برنگی
سنہری
روپہلی چوڑیاں
آدھے چاند سی
چن چن کر بھر لیتے تھے جھولی میں
ایک ایک کرکے موم بتی کی آگ میں موڑتے
حلقے بناتے
اور ایک زنجیر مکمل

اس عمر میں یادداشت کتنی تیز ہوا کرتی تھی
کوئی پوچھتا تو جھٹ کہہ اٹھتے تھے
یہ سکینہ کی چوڑی کا ٹکڑا ہے
یہ نازو نے عید کے موقعے پر خریدی تھی
یہ چھوٹا سا حلقہ
میری چوڑی کا ہے
اور یہ کالی چوڑی
سعیدہ کی ہے

اب اتنے برسوں بعد
جانے کیوں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی اک زنجیر
میری آنکھوں کے سامنے لہراتی اور بجتی رہتی ہے
بہت یاد کرنا چاہتی ہوں
کس کس کی چوڑی کے ٹکڑے ہیں
کچھ یاد نہیں آتا
مجھے یہ ساری ٹوٹی ہوئی چوڑیاں
میری ماں کی دکھائی پڑتی ہیں

نظم

شاہ نواز قریشی

264/64, Billouchpura
Lucknow - 226004

ہر طرف گھٹن ہے، ویرانی ہے
دھواں سا ہے
کہ آنکھیں جلنے لگتی ہیں
زندگی
لُو کا ایک تیز جھونکا بن گئی ہے
چاروں طرف صرف مکان ہیں
جن میں پتہ نہیں کون بستا ہے
کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی
کوئی کچھ پوچھتا نہیں
کوئی کچھ دیکھتا نہیں
مکان بھی پتھر کے ہیں اور مکیں بھی
آسمان بھی اداس رہتا ہے

سڑک بھی خاموش ہے
ذہن صرف سوچوں میں گم رہتا ہے
کمرے کا بکھراؤ
اندر تک پھیل گیا ہے
یا
اندر کا بکھراؤ
کمرے میں در آیا ہے
ہاتھ پیر سب سُن ہو گئے ہیں
جلتی سلگتی آنکھیں
جانے کسے ڈھونڈتی ہیں

میرا دل باؤلا کتّا ہے

انیس انصاری

Flat No. : 2, Type VI
Dalibagh Colony, Lucknow - 226001

جانے کیوں آنکھوں میں سرجو سی ندی بہتی ہے
بے سبب یوں ہی بہے جاتی ہے
یا سبب ہے تو حقیر
قابلِ ذکر نہ امرِ تدبیر
سنتے ہیں سبز علاقوں میں
ہر پیڑ بہت کاٹے گئے ہیں امسال
لوگ ذہنوں میں لگی آگ سے جلتے جلتے
شہر میں چاروں طرف تیشہ بکف پھیلے ہیں
تم اسی نگر میں پانی کی طرح لپکی ہو
روز اور شب کی حدِ وصل کے پاس
آگ کو ساحلِ سرجو میں ہی روکا جائے
آگ پانی میں اگر پھیل گئی

آگ کے سرخ جزیروں کے نواسی ہم لوگ
مفت میں آگ کے دریا میں ہی بہہ جائیں گے
تم اسی فکر میں سرجو کی طرح لپکی ہو
میں سلامت رہوں محفوظ رہوں
یہ بھی ممکن ہے
تمہیں وصل کی یک رنگ گلی سے ہٹ کر
ساحلِ آب کی شفاف ہوا بھائی ہو
زور سے ہنسنے کو جی چاہتا ہو
بہ برہم نام اڑانے میں مزا آتا ہو

میرا دل باؤلا کتّا ہے
اسے رونے دو
دلِ بے منطق و بے منزل و بے نیل مرام
شہر کی مسجدیں ویران ہیں
مقتول نمازوں کے لئے نوحہ گری کرتی ہیں
اور میرا دل خود بین محض
موسمِ ہجر کے آنے سے ڈرا جاتا ہے

تم کہیں ساحل سرجو پہ
شب و روز کی سرحد اوپر
سرخ شعلوں کو بجھاتی ہوگی
اور میرا دلِ بے منطق و بے منزل و گام
جانے کیوں آنکھوں میں سرجو کی طرح بہتا ہے
باؤلے کتے کی مانند صدا کرتا ہے
میرا دل
ہجر کے موسم میں یونہی روتا ہے
رونے دو اسے!

افسانہ

سوگوار

حسین الحق

Sh. Husain Ul Haq

S.S. Coliny
New karim Ganj
Gaya - 823001 (Bihar)

ابّا کی موت کا چوتھا دن تھا ـــــــــ

ابا، خاندان، احباب اور تعلق والوں کے لئے ایک ہر دل عزیز اور چھتنار فرد تھے، اس لئے ان کے انتقال پر کافی بھیڑ جمع ہوئی اور تین دنوں تک ایسا محسوس ہوا جیسے موت کا گھر نہیں شادی کا گھر ہو۔

چہارم کے بعد لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے، شام ہوتے ہوتے اکثر لوگ روانہ ہو گئے، صرف بہت قریبی رشتہ دار رہ گئے......جیسے چھوٹے ابا، کہ وہ تو ابّا کے بعد ہم لوگوں کے سرپرست اور مربّی ہی ہوئے، اس لئے ابا کی حالت بگڑنے لگی تو اسی وقت ان کو خبر دے دی گئی اور جس رات ابا نے انتقال کیا، چھوٹے ابا اس سے ایک دن پہلے ہی آ گئے تھے اور آنے کے بعد آخری وقت کی ساری خدمات انہی نے انجام دیں، دراصل ابّا اور چھوٹے ابّا صرف دو ہی بھائی تھے اور ان میں سے ایک رخصت ہو رہا تھا، حالت یہ تھی کہ ابا چھوٹے ابّا کا ہاتھ پکڑ کر روتے اور چھوٹے ابا منہ پھیر پھیر کر آنسو پونچھتے کہ بھیا کو تکلیف نہ ہو، ہمیں چھوٹے ابا کے دکھ کا پورا احساس تھا کہ ان کے بچپن کا آخری سہارا ان کے ہاتھوں سے چھوٹ رہا تھا مگر ہم کیا کر سکتے تھے، ہم بھائیوں پر تو پہاڑ ٹوٹنے والا تھا، پھر ہم لوگوں کے اپنے پھوپھا رشید عثمانی صاحب جن کے بیٹے ارشد بھائی سے چھوٹے ابا کی بیٹی کی منسوب چل رہی تھی گو کہ بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی مگر ہم لوگ تو ارشد بھائی اور باجی دونوں کو چڑاتے رہتے تھے، رشتوں کا حال بھی عجیب ہے، ہمارے اپنے بھیّا کی منسوب ہماری چچا زاد پھوپھی کی بیٹی نوشابہ آپا سے بالکل طے تھی مگر پتہ نہیں کیوں اپنے بھائی یا اس کی منگیتر کے سلسلے میں ویسی بے تکلفی پیدا ہی نہیں ہو پاتی۔

بہر حال، رشید پھوپھا اور نوشابہ آپا کے ابا رحمت پھوپھا بھی رک گئے تھے، پھر ایک پھوپھی زاد

بھائی سبط علی اور ماموں زاد بھائی وصی نسیم احمد ...... ملا جلا کر پانچ چھ خاندان کے افراد ہنوز گھر میں موجود تھے ۔چہارم کا دن گزار کر ...... رات کا کھانا ختم پر تھا تو کال بیل بجا، نوکر نے آکر بتایا: "سرکاری آفس سے لوگ آئے ہیں" "ڈرائنگ روم کھول کر بٹھاؤ"۔ بھیا جلدی سے بولے، نوکر الٹے پیروں واپس ہوا، بھیا کے کھانے کی رفتار تیز ہو گئی تھی ۔

اسی پل نوشابہ آپا کی ایک جھلک دکھائی دی، وہ بھیا کی طرف دیکھتی گذر گئیں، مگر بھیا انہیں نہ دیکھ سکے ۔ وہ کھانا جلدی ختم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے ...... اچانک مجھے بیدی کی کہانیوں کا ایک کردار درباری لال یاد آگیا، جو ایک خاص غرض سے مصری بھکارن کے بیٹے کو گودی گھمائے پھرتا ہے ..... مگر بھیا کو نوشابہ آپا نہ دکھائی دے سکیں تو مجھے درباری لال کیوں یاد آگیا؟

اسی پل نوکر نے آکر مجھے اور چھوٹے بھائی کو کہا: "بڑے صاحب بلا رہے ہیں" ہم ڈرائنگ روم پہنچے تو ابا کا ہی تذکرہ چھڑا ہوا تھا، ان کی آفس کے سبھی لوگ انتقال کے دن آئے تھے اور "انتم درشن" کر کے چلے گئے تھے، اب یہ ان کے اخلاق کے دوبالا ہونے کا ثبوت تھا کہ ان میں سے بہت سارے حضرات دوبارہ تشریف لائے ...... صرف ابا کے سینئر ڈائرکٹر، محکمے کے ڈائرکٹر جنرل اور آفس کے کئی عدد چپراسی اس وقت غیر حاضر تھے ۔

ہمارا کوارٹر سرکاری تھا، اس کا ڈرائنگ روم بہت آرام دہ اور ہوا دار تھا، چاروں طرف کھڑکیاں اور کمرے کے باہر کئی قسم کے پھول، ان کی لتیں اور خوشبوئیں، پھر ڈرائنگ روم کے اندر مدھم مدھم روشنی والا بلب، ایرکولر جاری، بڑے سے ہال میں سلیقے سے رکھے گدے دار صوفوں کا دو سیٹ، سائڈ ٹیبل پر گلدانوں میں خوشبو دینے والے موسمی پھول، حالانکہ سب باسی ہو چکے تھے مگر کچھ خوشبو تو اب بھی باقی تھی ۔ البتہ گرمی اور حبس کا احساس اس کے باوجود موجود تھا ۔

چھوٹے ابا، رشید پھوپھا، رحمت پھوپھا، سبط بھائی، وصی بھائی، اور ابا کے محکمہ جاتی دوست اور قریبی ماتحت، بھی سنجیدہ شکلیں بنائے بیٹھے تھے، ہم بھی بھیا کے پاس رکھی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے ..... ابا کے گہرے دوست اور کلیگ سکسینہ انکل بول رہے تھے :

" کاظم، تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم کمپنسیٹ گراؤنڈ پر اپنی نوکری بالکل پکی سمجھو، باقی بچے ساجد میاں تو یہ انگلش میں ایم اے کا امتحان دے چکے اس لئے میں نے ٹائمز گروپ والوں سے باتیں کر لی ہیں یہ اگر چاہیں تو کل ہما سے جوائن کر سکتے ہیں اور پھر جرنلزم کا کلاس تو شام میں بھی ہوتا ہے اس میں ایڈمیشن لے لیں، نو مہینے کا کورس ہے، لگ بھگ سال بھر لگے گا، ڈپلوما حاصل ہو جائے گا تو ٹائمز گروپ کی اکسپیرینس سرٹیفکیٹ پر باہر جانا آسان ہوگا، چھوٹے میاں تو ابھی پڑھ رہے ہیں انہیں اطمینان سے پڑھنے

دو۔ کوارٹر کے بارے میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بھگوان نے چاہا تو تمہاری سروس جلد ہی ہو جائے گی اور پھر یہی کوارٹر تمہارے نام الاٹ کرا دیا جائے گا، بھابھی کی فیملی پنشن بھی جلدی سے جلدی چالو کرانے کی کوشش کی جائے گی، ابھی ان تین دنوں میں گروپ انشورنس کا چیک بن گیا ہے" یہ کہتے ہوئے سکسینہ انکل نے رحمان چچا کو دیکھا جو محکمے کا اکاؤنٹس دیکھا کرتے تھے۔ رحمان چچا نے بیگ سے ایک چیک نکال کر بھیا کی طرف بڑھایا، بھیا نے اسے چھوٹے ابا کی طرف بڑھایا، چھوٹے ابا نے دیکھ کر اسے پھر بھیا کی طرف لوٹا دیا اور بولے:

"بیٹا۔ تم رکھو، اب ساری ذمہ داری تو تمہاری ہی ہے"

اسی درمیان میری نگاہ پڑ ہی گئی۔۔۔۔۔ ڈیڑھ لاکھ کا چیک تھا!

"اور یہ امپلائز ویلفیئر ایسوسی ایشن کی طرف سے ہے۔" شری واستو چاچا نے بھی ایک چیک بھیا کی طرف بڑھایا۔

میں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔۔۔۔۔۔ بے ساختہ میری نگاہ پھر چیک پر چلی گئی۔۔۔۔۔

پچاس ہزار کا چیک تھا۔۔۔۔۔۔ اور اسی پل بغیر سوچے ہوئے میرے ذہن میں ایک نمبر چمک اٹھا۔۔۔۔۔

۲۔۔۔۔۔/- "بھائی۔ آپ لوگوں نے واقعی دوست ہونے کی لاج رکھ لی۔" چھوٹے ابا نے بحیثیت سرپرست شکریہ ادا کیا اور چھوٹے بھائی عاصم کی طرف مڑ کر بولے۔ "بیٹا جاؤ بھابھی سے ریسیو کروا لو"

نہیں بھائی صاحب، ہم نے کچھ نہیں کیا۔" پرشانت انکل بولے۔ "سورگیہ ہاشمی صاحب کا سبھاؤ ایسا تھا کہ ہمیں کبھی لگا ہی نہیں کہ وہ ہمارے آفیسر ہیں، ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح ٹریٹ کیا، ہم نے سچ پوچھئے تو کچھ نہیں کیا، کیول اپنی ڈیوٹی نبھائی، چھوٹے بھائی کے ناطے ہم اور کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں مگر اپنی سیماؤں سے مجبور ہیں۔"

"پرشانت بھائی کے کہنے کا مطلب یہ ہے" رحمان چچا بولے۔ "کہ بچیوں کی منسوب آپ لوگ طے کر دیجئے۔ اُس وقت تک ہم لوگ آفس کے ذمہ ہاشمی بھائی مرحوم کا جو بھی پیسہ ہے سب نکال دیں گے۔"

"ہاں بھائی۔ بڑی مہربانی ہوگی"، چھوٹے ابا کا لہجہ گذارش سے پُر تھا۔ "میں بھی سوچتا ہوں کہ جلد از جلد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں، بھائی مجھ سے صرف تین برس بڑے تھے، جب وہ رخصت ہو گئے تو میں بھی کتنے دن ہوں؟"

"دیکھئے ایسا ہے کہ" سبط علی بھائی بولے۔ "میں بینک سروس میں ہوں اس لئے ماموں بینک کا سارا کام مجھی سے کراتے تھے۔ مجھے علم ہے کہ بڑی بچی کے نام انہوں نے جو فکسڈ ڈپازٹ کیا تھا وہ اب کچھ دنوں

ہیں لاکھ کے آس پاس پہنچ جائے گا اور چھوٹی بچی کے نام ابھی، برس پہلے ایک فکسڈ ڈپازٹ کیا تو خیر وہ تو ابھی اسکول ہی میں ہے۔"

"مگر زیور کا مسئلہ تو بہت بڑا ہوتا ہے۔" رشید پھوپھا بولے۔

"نہیں پھوپھا۔" بھیا نے اطمینان دلایا۔ "دونوں بہنوں کا زیور تقریباً تیار ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ یہ ایک بڑا بوجھ ہلکا ہوا۔" چھوٹے ابا نے اطمینان کا سانس لیا۔

"رحمت بھائی۔ آپ سے تو ہاشمی بھائی کا بڑا یارانہ تھا۔" پرشانت انکل کہنے لگے۔ "اس گھر کی ایک لکشمی آپ کیوں نہیں لے جاتے؟"

"بھائی۔ میں اس سلسلے میں بدنصیب ہوں۔" رحمت پھوپھا کے چہرے پر مسکراہٹ جیسی کسی شئے کا گمان ہوا مگر پل بھر میں چہرہ پچھلی کیفیت پر لوٹ آیا اور وہ بھاری آواز میں بولے۔ "مرحوم اس میں بھی بازی مار گئے۔ مجھے بیٹا نہیں ہے، اور میری بیٹی کا بوجھ وہی اٹھالے گئے۔"

"دیکھئے ایسا ہے کہ"........ رحمت پھوپھا کی بات رشید پھوپھا نے بیچ ہی میں کاٹ دی ......"اگر آپ لوگوں کو پسند ہو تو........ میرا بڑا بیٹا..... ارشد..... حاضر ہے...... وہ لکچرر ہے..... پرمننٹ بھی ریگولر ہے...... آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......"

"جزاک اللہ۔ اس میں ناپسندیدگی اور اعتراض کا کیا سوال ہے؟" رحمت پھوپھا رشید پھوپھا کی بات کاٹ کر بیچ ہی میں بولے۔

"مگر وہ تو......" چھوٹے ابا نے آہستہ سے رشید پھوپھا کا ہاتھ دبایا۔

"اکمل ہے نا؟" رشید پھوپھا نے بھی اتنی ہی آہستگی سے جواب دیا...... اور چھوٹے ابا بس ایک ٹک پھوپھا کو دیکھتے رہ گئے۔

مجھے چھوٹے ابا پر بڑا رحم آیا....... اکمل بھائی کی تو ابھی نوکری بھی نہیں لگی تھی۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔ بڑا شبھ کام ہو گیا۔" سکینہ انکل مسکراتے ہوئے بولے۔

"بھائی ہاشمی صاحب نے جیون میں جو پُن کئے، بھگوان اس کا بدلہ تو دے گا ہی۔" پرشانت انکل نے بات آگے بڑھائی۔

رحمت پھوپھا نے پرشانت انکل کی ہاں میں ہاں ملائی۔ رشید پھوپھا نے سر ہلایا۔ رشتے کے بھائیوں کی آنکھوں سے اثبات جھلک رہا تھا اور بھیا کی آنکھوں سے فخر...... میں نے چھوٹے ابا کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں ایک خالی پن سا نظر آیا....... بے ساختہ میری نگاہ دیوار گیر گھڑی پر ٹک گئی...... وقت

اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔
"تو اس کو اب ..... رشید صاحب ..... سمجھا جائے نا؟" سکینہ انکل نے شاید اطمینان کرنا چاہا۔
"میری طرف سے تو فائنل ہی ہے، اب یہ لوگ بتائیں، پھوپھا چھوٹے ابا اور رحمت پھوپھا کی طرف مخاطب ہوئے۔
"اب اتنی جلدی کیا کہا جائے؟ چھوٹے ابا کی آواز میں دراڑ پڑتی محسوس ہوئی۔
"تو اس میں دیر کی کیا ضرورت ہے؟" رحمت پھوپھا نے حیرت سے چھوٹے ابا کی طرف دیکھا۔
"بھابھی سے بھی تو پوچھنا ہوگا۔" چھوٹے ابا کی آواز بہانے کی چغلی کھا رہی تھی۔
"بھابھی کو اعتراض کیوں ہوگا۔؟" رحمت پھوپھا کی حیرت بھی اپنی جگہ صحیح تھی۔
"ارے بھائی"! .... ایسا لگا جیسے چھوٹے ابا جھلا سے گئے ..... پھر شاید کچھ سوچ کر تھتھم گئے اور لہجے کو ذرا مدھم کرتے ہوئے بولے ..... مطلب یہ ..... ایسا محسوس ہوا جیسے چھوٹے ابا تھوک نگل رہے ہوں، شاید گرمی کے سبب ان کا حلق خشک ہو رہا تھا ..... "مطلب یہ کہ اب تو چالیس کے بعد کچھ ہوگا۔" ان کا انداز پیچھا چھڑانے والا تھا۔
"جی ہاں، جی ہاں، چالیس تک تو رکنا ہی پڑے گا۔" رشید پھوپھا فوراً بولے، پھر اچانک بھیا کی طرف مڑے "بیٹا کاظم تمہارا کیا خیال ہے؟" .... ایسا لگا جیسے وہ اپنا اطمینان کرنا چاہ رہے ہوں .....
مگر دل عجب بے ایمان چیز ہے ..... اسی وقت سبطے بھائی کا جملہ یاد آگیا ..... بڑی بچی کے نام کا نکسڈ ڈپازٹ ..... میں نے سر جھٹکا ..... "بلاوجہ کا شک!"
"آپ لوگوں کا فیصلہ سر آنکھوں پر، میری کیا مجال!" بھیا کی آواز آئی۔
"نہیں بیٹا" چھوٹے ابا کی آواز بھیک مانگ رہی تھی "اب شرعی طور پر تم سرپرست ہو، تمہاری مرضی اور اجازت اوّل ہے۔"
"بس چھوٹے ابا۔ آپ لوگوں کی پسند میری پسند!"
چھوٹے ابا نے آہستہ سے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ اور رشید پھوپھا نے، صوفے سے ذرا اٹھ کر ارشد بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سکینہ انکل کو متوجہ کیا ..... "یہی ہے میرا بڑا بیٹا!"
ارشد بھائی نے ذرا شرما کر آداب کیا اور سکینہ انکل، پرشانت انکل دونوں نے دعائیں دیں "جگ جگ جیو!"
"میں تو کہتا ہوں۔" پرشانت انکل چھوٹے ابا کی طرف مخاطب ہوئے "چالیس کے بعد کاظم بیٹا اور بچیا دونوں کا بیاہ ایک ساتھ کر دیجیے۔"
"ہاں تو اور کیا؟ بیٹی رخصت ہوگی تو بہو گھر کا اکیلاپن دور کرے گی، کیوں رحمت بھائی"، سکینہ انکل نے

رحمت پھوپھا کو ٹٹولا۔

"میں ہر حال میں تیار ہوں بھائی" رحمت پھوپھا کے پاس حامی بھرنے کے سوا چارہ کیا تھا؟

بھیّا اور ارشد بھائی، دونوں تھوڑا شرمائے جاتے تھے اور کچھ کچھ سنجیدہ اور سوگوار بھی ہوئے جاتے تھے جیسے رخصتی کے وقت دولہا خوش بھی ہوتا ہے اور ساس سُسر سے نظریں چار ہوتے ہی سنجیدہ بھی ہو جاتا ہے۔

پھر ابّا کی بات نکل آئی، ان کی انتظامی صلاحیت، سخاوت، انکسار، نرم دلی.... سکینہ انکل، پرشانت انکل اور رحمان چچا اور پھر ابا کی تعریف کرنے لگے، رشید پھوپھا اور رحمت پھوپھا اپنی برسہا برس کی دوستی اور بے تکلفی کا ذکر نکال بیٹھے۔ بیچ بیچ میں بھیا ابا کی مشفق اور سربراہانہ شخصیت کا تعارف کراتے جاتے تھے...... پھر گفتگو کا رخ مڑا، مختلف قسم کے گھریلو معاملات اور خاص طور پر چہلم کے اہتمام کے سلسلے میں تبادلہ خیال کیا جانے لگا...... ہر آدمی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ پورا کمرہ آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔

صرف چھوٹے ابا آنکھیں بند کیے، صوفے کی پُشت سے سر ٹکائے نیم دراز تھے، دونوں ہاتھ بیجان سے صوفے پر پڑے ہوئے، ہونٹ بند، چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری، سانس کی آمد و رفت جاری! ابا کی موت کا یہ چوتھا دن تھا ——— !!

●●●

افسانہ

بدلتے رنگ

شموئل احمد

301, Grand Apartment
New Patliputra Colony
Patna - 800013 (Bihar)

Sh Shimail Rang

جب کہیں دنگا ہوتا سلیمان رکمنی بائی کا کوٹھا پکڑتا۔ اس کے ساتھ وہسکی پیتا اور دنگائیوں کو گالیاں دیتا۔ رکمنی بائی خود اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی اور پولیس کو "بھڑوی کی جنی" کہتی تب کہیں سلیمان کے دل کی بھڑاس نکلتی اور اس کو یہ جگہ محفوظ نظر آتی۔ یہاں ذات پات کا جھمیلا نہیں تھا اور یہ بات سلیمان کو بھاتی تھی ورنہ اس کے لئے مشکل تھا کہ کہاں جائے اور کس سے باتیں کرے......؟؟

سلیمان کو مذہب سے دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کا ایسا ماننا تھا کہ مذہب آدمی کو جوڑتا نہیں ہے اور وہ آدمی کو جوڑنے کی بات کرتا تھا اور اس کے حلقہ احباب میں بھی زیادہ تر دوسرے مذہب کے لوگ تھے اور وہ ان میں مقبول بھی تھا۔ پھر بھی جب شہر میں فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلتی تو وہ ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتا۔ اس کو اپنے دوستوں کا رویہ یکسر بدلا ہوا محسوس ہوتا اور سبھی مذہبی جنون میں مبتلا نظر آتے۔ ان کی باتوں سے فرقہ پرستی کی بو آتی جس سے سلیمان کی الجھن بڑھ جاتی۔ سب سے زیادہ کوفت تو اس کو بیوی کی باتوں سے ہوتی۔ اس کے پاس ایک ہی ٹکا سا جواب تھا... مسلمان اپنے دین پر نہیں ہیں اس لئے اللہ یہ دن دکھا رہا ہے.... سلیمان کچھ کہنا چاہتا تو یہ کہہ کر اس کو فوراً چپ کر دیتی کہ آپ کیا بولیں گے......؟ آپ تو جمعہ کی نماز تک ادا نہیں کرتے.....!

اور سلیمان جمعہ کی نماز ادا نہیں کرتا تھا لیکن آدمی کو جوڑنے کی بات کرتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ آدم کی کہانی پر یقین کرنے کا مطلب ہے کہ فرقہ پرستی کے بیج آدم سے ہی نسل آدم میں منتقل ہوئے.... آخر ابلیس آدم کو سجدہ کیوں کرتا....؟ وہ آگ سے بنا تھا اور آدم مٹی کے تھے..... دونوں الگ الگ فرقے کے تھے.... یہ کائنات کی پہلی فرقہ پرستی تھی جو خدا نے آسمان میں رچی..... سلیمان کو لگتا شاید خدا کی طرح فرقہ بھی چھیڑنے کے لئے

اس قسم کی باتیں کرتا تو وہ چیخ چیخ کر کہتی ۔

"حشر میں کیا منہ لے کر جائیے گا.....؟ کچھ تو خدا کا خوف کیجئے ....."

سلیمان کی یہ حسرت تھی کہ کاش! کوئی تو ایسا ملتا جو آدمی کی بات کرتا لیکن سبھی مذہب کا رونا روتے تھے لے دے کر ایک زندگیاں ہی رہ گئی تھیں جو ذات پات کے جھمیلے سے آزاد نظر آتی تھیں.... سلیمان کو کوٹھا راس آگیا تھا اور جب کہیں دنگاں ہوتا تو سلیمان ....

اس بار دنگا اس کے آبائی وطن میں ہوگیا اور اخبار میں وہاں کی خبریں پڑھ پڑھ کر وہ جیسے دیوانہ ہو گیا ۔ اس کو اخبار بینی سے گرچہ زیادہ دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس نے ایک طرح سے اخبار پڑھنا ترک ہی کر دیا تھا۔ آئے دن لوٹ مار اور قتل و غارت کی خبریں ہی شائع ہوتی تھیں جنہیں پڑھ کر اس کو ہمیشہ الجھن محسوس ہوتی تھی لیکن اس بار خبروں کی نوعیت کچھ اور تھی ۔ معاملہ آبائی وطن کا تھا اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہاں کی خبریں پڑھ رہا تھا اور یہ پتہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کون سا علاقہ کس حد تک متاثر ہوا ہے؟

لوگائی گاؤں کا واقعہ پڑھ کر سلیمان کے دل میں ہول سا اٹھنے لگا ۔ اس نے اخبار پھینک دیا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا ۔

" گاؤں کا گاؤں صاف ہوگیا ...... گاؤں کا گاؤں ....!!" اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور اس کو یکایک سعیدہ کی یاد آگئی ....

سلیمان کو اپنا وطن ترک کئے گرچہ ایک عرصہ گذر گیا تھا اور وہ روزی روٹی کے چکر میں بہت دور آبسا تھا لیکن وہاں کی یادیں اس کے دل کے نہاں خانوں میں اب بھی محفوظ تھیں ...... وہاں کی گلیاں اور کوچے وہ بھولا نہیں تھا جہاں اس کا بچپن گذرا تھا ... خصوصاً گلی کے نکڑ والا وہ کھپریوش مکان جہاں سعیدہ رہتی تھی۔ سعیدہ جس کے ہونٹوں پر اس نے ایام نوخیزی کا پہلا بوسہ ثبت کیا تھا۔ ..... اس بوسے کی حلاوت ابھی تک اس کی روح میں گھلی ہوئی تھی ۔ ..... اس کو یاد تھا سعیدہ کس طرح شرمائی تھی اور آنچل میں منہ چھپاتی ہوئی اندر بھاگ گئی تھی ۔

سلیمان کو یاد آگیا سعیدہ کی شادی لوگائی گاؤں میں ہوئی تھی اور لوگائی گاؤں میں ہی یہ واقعہ پیش آیا تھا...... اس کے دل میں پھر ہوک سی اٹھی .... وہ سر تھام کر بیٹھ گیا..... اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ آدمی اس حد تک وحشی ہو سکتا ہے اور خود مقامی پولیس بھی ۔

اس کو لگا یہ فساد نہیں نسل کشی ہے ...... اجتماعی قتل کی خوفناک سازش .... اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ....

سلیمان کی کیفیت افتلاجی ہوگئی۔ اس کو وہسکی کی طلب ہوئی۔ اس نے الماری سے بوتل نکالی اور کمرے کے نیم تاریک گوشے میں بیٹھ گیا۔ گلاس میں وہسکی انڈیلتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اچھا ہی تھا اس کی بیوی اس وقت میکے میں تھی ورنہ وہ گھر میں بیٹھ کر اس طرح غم غلط نہیں کر سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ یقیناً چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتی اور اسی کو باہر کا رخ کرنا پڑتا۔

سلیمان نے وہسکی کا ایک لمبا گھونٹ لیا اور کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے اسی طرح بیٹھا رہا۔۔۔۔۔۔۔ ناگہاں اخبار کی رپورٹ اس کے ذہن میں چوکے لگانے لگی۔

"پہلے لاشیں کنویں میں پھینکیں۔۔۔۔۔۔۔"

پھر چیل اور کوے منڈلانے لگے تو۔۔۔۔۔

"اوہ!!!"_____ سلیمان نے جھرجھری سی لی۔

"کنویں سے نکال کر کھیتوں میں دفن کر دیا۔۔۔۔۔۔"

"پھر فصل لگادی۔۔۔۔۔۔"

"ناقابل یقین___ ناقابل یقین_____" وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔

سلیمان کو لگا اس کی بے چینی کم ہونے کے بجائے بڑھ رہی ہے۔۔۔۔۔ اس کو پھر سعیدہ یاد آگئی۔ اس نے وہسکی کا ایک اور لمبا گھونٹ لیا۔

"پتہ نہیں کس حال میں ہوگی _______؟"

گلاس میں بچی ہوئی وہسکی اس نے ایک ہی سانس میں ختم کی۔ پھر کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر اسی طرح آنکھیں بند کیں تو کوئی جیسے آہستہ سے اس کے کانوں میں پھسپھسایا۔

"گاجر اور مولی کی طرح۔۔۔۔۔۔"

سلیمان کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کرسی سے اٹھ کر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح چہل قدمی کرتا رہا۔ پھر اس نے یکایک بیگ اٹھایا۔ اس میں وہسکی کی بوتل رکھی۔ تولیہ اور صابن بھی رکھا اور فلیٹ میں تالا لگا کر باہر آیا۔ وہ اب جلد از جلد رکمنی بائی کے کوٹھے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

اس نے رکشہ کے لئے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو سڑک کی دوسری طرف اپنا پڑوسی دکھائی دیا۔ سلیمان فوراً ایک دکان کی اوٹ میں گیا۔ وہ اس وقت اس سے ہم کلام ہونا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کی نظر سلیمان پر پڑ ہی گئی۔۔۔۔۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو سلیمان نے یہ سوچ کر کوفت محسوس کی کہ پتہ نہیں کیا کیا بکے گا۔۔۔۔۔۔؟

قریب آکر پڑوسی نے رازدارانہ لہجہ میں بتایا کہ شہر میں تناؤ پھیل رہا ہے اور بہت ممکن ہے شہر میں کرفیو لگ جائے .... پھر اس نے سلیمان کے کندھے سے لٹکے بیگ کو دیکھ کر تشویش ظاہر کی کہ اس وقت اس کا باہر جانا ....

تب سلیمان نے مختصراً جواب دیا تھا کہ وہ ایک دوست کے گھر جا رہا تھا جہاں وہ یقیناً محفوظ رہے گا .... اور اچک کر ایک رکشہ پر بیٹھ گیا تھا .... لیکن اس سے پہلے کہ رکشہ آگے بڑھتا اس شخص نے ایک سوال داغ دیا تھا۔

"آپ لوگ جلوس کو راستہ کیوں نہیں دیتے ......؟"

سلیمان بھنا گیا .... اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ بے حد غصّہ میں اس نے رکشہ آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ رکشہ آگے بڑھا تو سلیمان نے مڑ کر نفرت سے اس آدمی کی طرف دیکھا اور غصّہ میں بڑبڑایا۔

"سالا .... مجھے بھی ان لوگوں میں سمجھتا ہے ......"

رکشہ جب بازار سے گذرا تو اس نے محسوس کیا کہ فضا میں واقعی تناؤ ہے۔ دکانوں کے شٹر گرنے لگے تھے آگے چوک کے قریب کچھ لوگ آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ سلیمان کا رکشہ قریب سے گذرا تو ایک نوجوان نے اس کو گھور کر دیکھا۔

سلیمان کو لگا اس وقت رکشہ پر وہ ایک آدمی کی صورت میں نہیں فرقہ کی صورت میں جا رہا ہے اور لوگوں کی نگاہیں اس میں اس کا فرقہ ڈھونڈ رہی ہیں .... اس نے ایک لہر سی محسوس کی .... کیا ہو اگر ابھی دنگا ہو جائے ....؟ وہ یقیناً مارا جائے گا .... وہ کوئی جواز پیش نہیں کر سکتا کہ اس کو فرقے اور مذہب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے .... وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ایک مخصوص فرقے میں پیدا ہوا ہے .... آدمی مذہب بدل سکتا ہے فرقہ نہیں .... مذہب آدمی کا مقدر نہیں ہے .... فرقہ آدمی کا مقدر ہے جو اس کی پیدائش سے پہلے اس کے لئے طے ہوتا ہے .... اور پھر سلیمان کو یہ سوچ کر عجیب لگا کہ ایک آدمی صرف اس لئے مارا جائے کہ وہ دوسرے فرقہ میں پیدا ہوا ہے .... دوسرے فرقے میں ....

اس کو سگریٹ کی طلب ہوئی اس نے جیب سے ماچس اور سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ ایک سگریٹ ہونٹوں سے دبایا اور ماچس جلانے کی کوشش کی تو تیلی ہوا میں بجھ گئی۔ رکشہ کی چال تیز تھی۔ تب سلیمان نے ماچس کو سگریٹ کے قریب رکھا اور تیلی کو ماچس سے رگڑتے ہی سگریٹ کے گوشے سے سٹا دیا اور زور سے دم کھینچا ...... تیلی بجھ گئی لیکن سگریٹ کا گوشہ سلگ گیا ...... سلیمان نے جلدی جلدی دو چار کش لگائے .... سگریٹ اچھی طرح

سلگ گئی تو اس نے ایک لمبا کش لگایا اور ناک اور منہ سے دھواں چھوڑتا ہوا ایک بار چاروں طرف طائرانہ نظر ڈالی ...... سڑک پر لوگ باگ اب کم نظر آرہے تھے۔ موڑ کے قریب رکشہ والے نے پوچھا کہ کدھر جانا ہے تو سلیمان نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ رکشہ بائیں طرف پتھریلی سڑک پر مڑا تو اس نے سگریٹ کا آخری کش لیا ...... کچھ دیر میں رکشہ رکمنی بائی کے کوٹھے کے قریب تھا۔

رکشہ سے اتر کر اس نے ایک بار ادھر ادھر دیکھا اور یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا کہ یہاں بھی ماحول میں ....

کچھ دلال ایک طرف کونے میں کھڑے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ سلیمان کو دیکھ کر ایک نے دوسرے کو کنکھی ماری اور ہنسنے لگا۔ سلیمان کو اس کی ہنسی تضحیک آمیز لگی۔ وہ ان کو ناگوار نظروں سے گھورتا ہوا کوٹھے کی طرف بڑھا تو دلال نے سلیمان کو ٹوکا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے صاحب ____"

اور پھر سب کے سب ہنسنے لگے۔ سلیمان کو ان کا رویہ بہت عجیب معلوم ہوا۔ لیکن کچھ کہنا اس نے مناسب نہیں سمجھا وہ چپ چاپ سیڑھیاں چڑھتا ہوا کوٹھے پر پہنچا تو رکمنی بائی اس دیکھتے ہی دروازے کے پاس تن کر کھڑی ہو گئی۔

"خیر تو ہے ____" سلیمان مسکرایا۔

"یہاں نہیں ...." رکمنی بائی چمک کر بولی۔

"پھر کہاں میری جان ____!" سلیمان ہنسنے لگا۔

"اپنی ماں بہن کے پاس جاؤ "

"کیا بکواس ہے ____؟" سلیمان جھلا گیا۔

"یہاں نہیں ____" رکمنی بائی نے بدستور ہاتھ چمکایا ____

"میں ہمیشہ تمہارے پاس آتا ہوں۔ ____"

"اب نہیں ____"

"دیکھو یہ ---- یہ ظلم مت کرو....... یہ میری جائے اماں ہے..... یہاں سے نکال دو گی تو کہاں جاؤں گا ____؟"

"کہیں بھی جاؤ ____" رکمنی بائی اسی طرح اینٹھ کر بولی

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے .... ؟ شہر میں کرفیو لگنے والا ہے ...... یہاں سے نکالا گیا تو مارا جاؤں گا"

"میں کچھ نہیں جانتی ____"

"رکمنی بائی ..... پلیز .... "سلیمان گھگھیانے لگا ....

"میں کچھ نہیں جانتی ___" رکمنی بائی اسی طرح چمک کر بولی۔

"آخر کیا ہو گیا ہے تمہیں ...... ؟ تم کیا چاہتی ہو .... ؟ بلوائی مجھے کاٹ دیں ..... یا پولیس مجھے گولی مار دے .... ؟؟"

"میں مجبور ہوں ___" رکمنی بائی اسی طرح تن کر کھڑی تھی۔

"یہ غضب مت کرو .... میں تمہارے کوٹھے کے علاوہ اور کہیں نہیں جاتا ...... یہ میرا گھر ہے ..... میں برسوں سے تمہارے پاس آ رہا ہوں ....."

رکمنی بائی چپ رہی۔

سلیمان کو لگا رکمنی بائی پسیج رہی ہے۔ اس کا لہجہ کچھ اور خوشامدانہ ہو گیا۔

"میری اچھی رکمنی بائی ...... پلیز مجھے اندر آنے دو ___"

رکمنی بائی نے ایک لمحہ توقف کیا اور راستہ چھوڑ کر ہٹ گئی۔ سلیمان اندر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

لیکن اب اس کو ماحول میں پہلے جیسا گھریلو پن محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار بے دلی سے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے طاق میں بھگوان کی چھوٹی سی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ جہاں اگربتی جل رہی تھی۔ سلیمان کو مورتی کے ماتھے پر سندور کا داغ بہت تازہ معلوم ہوا۔

بیگ سے وہ وہسکی کی بوتل نکالنے لگا تو رکمنی بائی بولی۔

"ٹائم نہیں ہے ___"

"کیوں ___ ؟"

"بس کام کر کے جاؤ ___"

سلیمان نے کچھ عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اس نیت سے تمہارے پاس نہیں آتا ہوں ...... بس دو گھڑی بات کر کے جی ہلکا کر لیتا ہوں ..... اور کہاں جاؤں ...... ؟ کس سے بات کرو .... ؟ آدمی کی بات کوئی نہیں کرتا ....."

رکمنی بائی کپڑے اتارنے لگی تو سلیمان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ذرا بیٹھو تو ...... بات تو کرو ..... تمہیں کیا بتاؤں کتنا بھیانک دنگا میرے وطن میں ہوا ہے۔ پولیس نے بھی ....

رکمنی بائی نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"باتوں کا ٹائم نہیں ہے ـــــــ"

سلیمان کو ٹھیس لگی۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"کیا یہاں بھی ذات پات کا فرق شروع ہو گیا ـــــــ ؟"

"پنچایت کا فیصلہ ہے ـــــــ"

"کیسا فیصلہ ـــــــ ؟"

رکمنی بائی ہنسنے لگی۔

سلیمان کو اس کی ہنسی بہت عجیب لگی .... وہ ناگوار لہجے میں بولا۔

"کچھ بولو گی بھی ـــــــ ؟"

"اپنی برادری میں جاؤ ـــــــ"

"آخر کیوں ـــــــ ؟"

"تم کٹوا ہو ـــــــ !!!"

سلیمان سکتے میں آگیا ......

رکمنی بائی بے تحاشہ ہنس رہی تھی ....

اور دفعتاً سلیمان کو محسوس ہوا کہ وہ واقعی کٹوا ہے ...... اپنے مذہب اور فرقے سے کٹا ہوا...... وہ لاکھ خود کو ان باتوں سے بے نیاز سمجھے لیکن وہ مجھے کٹوا ....

اور سلیمان کو عدم تحفظ کا ایک عجیب سا احساس ہوا .... اس نے جلتی ہوئی آنکھوں سے رکمنی بائی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح ہنس رہی تھی .... اور سلیمان کا دل غم سے بھر گیا وہ یکایک اس کی طرف مڑا اور اس کے بازوؤں میں اپنی انگلیاں گڑائیں ......

رکمنی بائی درد سے کلبلائی ......

سلیمان نے بازوؤں کا شکنجہ اور سخت کیا .....

رکمنی بائی پھر بلبلائی .....

دفعتاً اس کو محسوس ہوا جیسے رکمنی بائی طوائف نہیں ایک فرقہ ہے ...... اور وہ اس سے ہم بستر نہیں ہے ...... وہ اس کا ریپ کر رہا ہے ......

سلیمان کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود مسکراہٹ رینگ گئی .....

اور کچھ دیر بعد رکمنی بائی باتھ روم میں گئی تھی تو سلیمان کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ بستر سے

اٹھ گیا اور اپنے کپڑے درست کرنے لگا۔ ناگہاں اس کی نظر رکمنی بائی کی ساڑی پر پڑی جو سرہانے پڑی ہوئی تھی سلیمان کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے چمکیں۔۔۔۔ اس نے جھپٹ کر ساڑی اٹھائی اور جلدی جلدی بیگ میں ٹھونسنے لگا۔۔۔۔۔۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی اور چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئیں۔۔۔۔ پھر اس نے بیگ کو کندھے سے لٹکایا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے اترا اور گلی پار کرکے سڑک پر آ گیا۔

سڑک دور دور تک سنسان تھی۔۔۔۔۔۔ لیکن اتفاق سے ایک رکشہ اس کو جلد ہی مل گیا۔ وہ اچک کر اس پر سوار ہو گیا۔

رکشہ کچھ آگے بڑھا تو پسینے سے بھیگے ہوئے چہرے پر ٹھنڈی ہواؤں کے لمس سے سلیمان نے راحت محسوس کی۔۔۔۔۔ کچھ دور جانے پر اس نے بیگ کے اندر ہاتھ ڈال کر ساری کو ایک بار چھوا۔۔۔۔۔۔

اور اس کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ رینگ گئی۔۔۔۔۔۔

★★★★

افسانہ

ڈر

Sh. Kamal Ahmad

کمال احمد

D-34/1, Sir Sayed Ahmed Road
Calcutta - 14, West Bengal

سینے پر پتھر کی سل تڑواتے اسے دس سال بیت گئے تھے۔

چالیس سال کی عمر میں وہ ساٹھ سال کا لگنے لگا تھا۔

چھاتی اندر کو دھنسی ہوئی، آنکھیں ویران، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی برسوں کا بیمار لگنے لگا تھا وہ۔ شالو کی ماں نے مرتے وقت پتھر کی جو بھاری سل اس کی چھاتی پر رکھی تھی اسے وہ آج تک ہٹا نہیں پایا تھا۔ اب تو سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ تماشے کا یہ آخری آئٹم پیش کرتے وقت وہ کتنی بار جینے کی اذیت جھیل چکا تھا۔ ——— اور پھر جب ایک دن اس نے ہتھوڑا دادو کے ہاتھوں میں دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی چھاتی پر پتھر کی سل نہیں شالو بیٹھی ہے اور دادو کا نشانہ ضرور چوکے گا۔ اور وہ ہتھوڑے کی ایک ضرب سے اس کے سر کو پاش پاش کردے گا۔

جب سے اس نے شالو کو ڈھولک کی تھاپ پر بیٹھایا تھا مجمع اچھا خاصہ لگنے لگا تھا۔ آمدنی بھی بڑھ گئی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا اس آمدنی کے پیچھے ڈھولک کی تھاپ نہیں بلکہ شالو کی ابھرتی ہوئی جوانی تھی۔ شالو کی جوانی کو غربت کی تنگ چادر چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ وہ تو اس دن چونکا تھا۔ جب دادو نے تماشہ کے بعد اس کے ہاتھ میں بیس روپے کا نوٹ دے کر شالو کو آنکھ ماری تھی۔

جب تک شالو کی ماں زندہ تھی وہی اس کے ساتھ تماشے دکھایا کرتی تھی۔ رسّی پر اسی خوبی سے چلتی تھی کہ جیسے مصیبت کی ہر کھائی وہ اسی خوبی سے پار کرلے گی۔ ——— لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ———

اس روز نہ جانے کس طرح وہ خلیج پار نہ کر سکی اور رسی پر سے گر پڑی۔ فوراً اسے اسپتال پہنچایا گیا، حمل کے ضائع ہو جانے پر خون کافی بہہ گیا تھا۔ کچھ دنوں اسپتال میں رہنے کے بعد اسے چھٹی دے دی گئی ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اسپتال کا بیڈ کافی دنوں تک ایک مریض کے لئے انگیج نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کمر کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ سال بھر گھر پر بیمار رہنے کے بعد وہ ایک دن زندگی اور موت کے درمیان کی کھائی پار کر گئی۔

شالو کی ماں کی موت کے بعد اس کے لئے تو اس کو دیکھنا مشکل ہو گیا۔ اس ہمواری پر چلنا کسی کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ اور شالو بہت چھوٹی تھی۔

وہ جانتا تھا خون کی لذت سے آشنا لوگوں کو موت کا کھیل زیادہ پسند ہے۔ چنانچہ اس نے چھرا پھینکنے کا تماشہ شروع کیا۔ نشانہ تھی شالو۔ پہلے تو شالو بہت روتی تھی ڈرتی تھی کہ اس کے باپ کا نشانہ چوک نہ جائے۔ اور خنجر اس کے سینے کے پار نہ اتر جائے لیکن بہت منانے پر وہ راضی ہو جاتی اور آنکھیں موندے آنے والی مصیبت کا سامنا کرتی۔

اور واقعی کبھی کبھی تو اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ ایک خنجر شالو کے پیٹ میں اتار دے اور دوسرا خود گھونپ لے کہ سارا جھمیلا تو اسی کا ہے۔

پھر کیا ہوا کہ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں اور ایک دن تو آخری خنجر پھینکتے وقت اس کا ہاتھ بری طرح کانپا اور خنجر شالو کے دائیں ہاتھ کی کلائی میں گھس گیا۔ ——— اسپتال میں شالو کی مرہم پٹی کے بعد اس نے اپنی آنکھیں چیک اپ کرائیں۔ اس کی بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے خنجر کا تماشہ بند کرنے کو کہہ دیا۔ آنکھوں میں عینک کے اضافہ کے بعد اس نے پتھر کی سل سینے پر توڑوانے کا آئٹم شروع کیا۔ بھیڑ پھر جمنے لگی۔

اور جب آج اس نے دادو کے ہاتھ میں ہتھوڑا دیکھا تو بری طرح کانپ گیا۔

دادو کا پورا نام نبی داد تھا لیکن اسے لوگ دادو کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ تھا تو اس کی بستی کا لیکن اس سے اس کی کوئی بات چیت نہیں تھی اور پھر جب اس نے سنا کہ دادو نے اپنی پہلی بیوی کو تین بچوں سمیت گھر سے نکال دیا ہے اور وہ بیچاری بڑے راستے کے فٹ پاتھ پر بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے تو اسے دادو سے نفرت سی ہو گئی۔

دادو کرتا کیا تھا یہ تو اس کی سمجھ میں آج تک نہ آیا لیکن اتنا جانتا تھا کہ پارٹی اور تھانے میں اس کا اثر و رسوخ ہے۔ پھر اس نے سنا دادو نے رمضان باڑی والے کی لڑکی سے شادی کر لی اور اس کی چھوٹی بہن کو

بھی اپنے ساتھ رکھ لیا، دو سگی بہنیں سوتن کس طرح ہو سکتی ہیں یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کیوں کہ شریعت کے مطابق تو یہ ناجائز ہے۔

اور اب دادو کی نظر شالو پر تھی۔

شالو کو گھر پر چھوڑ کر وہ اکیلے تماشہ دکھانے لگا۔ آمدنی کم ہو گئی تھی لیکن وہ مطمئن تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے فضا بگڑی ہوئی تھی۔ جیسے مذہبی سیاست نے دو فرقوں کے درمیان کی خلیج کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ لوگ ریڈیو کے قریب جمع ہونے لگے تھے، ان میں وہ بھی شامل ہوتا۔ کسی کو یہ امید نہیں تھی مسجد اس طرح توڑ دی جائے گی۔ حالانکہ مسجد سے اس کا تعلق برائے نام تھا۔ صرف عید بقرعید کی نماز تک لیکن اس مسجد کے ٹوٹنے کی خبر سن کر اس کا دل نہ جانے کیوں بیٹھ گیا تھا۔ مسجد کے ٹوٹنے کے بعد پورے ملک میں فسادات کا سلسلہ چل پڑا۔ گھروں میں مکین سمیت آگ لگائی جا رہی تھی۔ ماں بہنوں کی عزت لوٹی جا رہی تھی اور ان منظروں کو کیمروں میں بند کیا جا رہا تھا۔ دو دن وہ کرفیو کی وجہ سے باہر نکل نہیں سکا۔ تیسرے دن جب کرفیو دو گھنٹے کے لئے اٹھایا گیا تو وہ باہر نکلا۔ گھر میں راشن ختم ہو چکا تھا اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ دکانوں میں لمبی قطار لگی ہوئی تھی، وہ کسی شناسا کو تلاش کر رہا تھا کہ کچھ پیسے ادھار مانگ سکے۔

اچانک اس کی نظر دادو پر پڑی جو کچھ دوری پر کھڑا چندہ وصول رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر وہ آگے بڑھا۔

دادو لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ فرقہ والوں نے مسجد توڑی ہے ہم ان کے مندر توڑیں گے۔ آج کی رات بہت خطرہ ہے۔ دشمن ہماری بستی پر حملہ کریں گے ہمیں لڑائی کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ ہمیں بم بنانا ہے ہماری ماں بہنوں کی عزت خطرے میں ہے۔ دادو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر صرف بموں کے دھماکے سے دشمن کو کتنی دیر روکا جا سکتا ہے۔

دادو کی نظر اس پر پڑی۔ وہ قریب آیا۔

مٹھی سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے بولا

"چاچا اسے رکھو۔"

"کا ہے؟"

"چاول، گیہوں کے لئے۔ راشن دکان بند رہے گی

"تجھے نہیں چاہئے"

"دنگا بند نہیں ہوگا۔ نہ جانے کب تک گھر میں بند رہنا پڑے"

اس کے جی میں آیا کہہ دے جب تیرے جیسا آدمی سیدھے سادے لوگوں کا محافظ بن چکا ہو تو دنگا کس طرح بند ہوگا۔ لیکن وہ کہہ نہیں پایا اور غصے میں بھرا لوٹ آیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر شالو پر پڑی۔ وہ چکرا سا گیا۔ شالو کے جسم میں اسے کچھ نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ اسے حیرت تھی آج سے پہلے اس نے یہ تبدیلی محسوس کیوں نہیں کی ـــــ باپ کو اس طرح گھورتے دیکھ کر شالو گھبرا گئی۔

"ادھر آ"

ڈرتے ڈرتے وہ اس کے قریب آئی۔ اس نے شالو پر لات اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

شالو چپ چاپ مار کھاتی رہی، روتی رہی ـــــ مارتے مارتے تھک کر وہ بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اب کیا کرے۔ شالو روتے روتے کہہ رہی تھی "اس کی غیر حاضری میں دادو برابر آتا رہا تھا اور اس نے وعدہ کیا ہے اگر وہ راضی ہو جائے تو دادو اسے اپنی نکاح میں لے لے گا۔"

اور شالو اس کے قدموں پر گر کر زار و قطار رو کر التجا کر رہی تھی کہ وہ مان جائے اور اس کی نکاح دادو سے کرا دے۔

اور وہ گم سم سوچ رہا تھا۔

کاش یہ دنگا نہ تھمے اور بلوائی اسے اور شالو کو کمرے میں بند کر کے آگ لگا دیں۔

●
●

افسانہ

یہ کسی ایک تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے

مشرف عالم ذوقی

Sh. Musharraf Alam Zauqi

R/101, Taj Enclave
Link Road, Geeta Colony
Delhi - 110031

صاحبو، میرا یقین کیجئے۔ مرنے والا آدمی کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور وہ بھی ایسی صورت میں جب تو یوں میری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو۔ کتے کی صورت، تو صاحبو، اسے گالی مت تصور کیجئے۔ بس یہی غلطی ہوئی مجھ سے اور میں اقرار کرتا ہوں کہ...... اس رات نہ میں نے پی رکھی تھی، نہ کسی طرح کا دوسرا کوئی نشہ کر رکھا تھا اور نہ ــــــــ صاحبو، اس اقرار سے بھی اگر آپ کوئی نتیجہ نہ نکال پا رہے ہوں تو مجھے سو جوتے مار لیجئے۔ مگر خدا کے واسطے اس کتے کو ضرور تلاش کیجئے جو پتہ نہیں کب کیسے اس اندھی تاریک رات کی اس گلی سے ہوتا ہوا چپ چاپ میرے بدن میں اتر آیا تھا۔

یقین نہیں آیا تو میں آپ کو اس پراسرار، ڈراؤنی اور تاریک رات کی اس گلی میں لے جاتا ہوں جہاں بدبو تھی یا میں تھا۔ گلی کا چوکیدار تھا اور ایک کتا۔ جس کی سہمی سہمی آنکھیں کبھی میری طرف دیکھتیں، کبھی بند گیٹ کے باہر سنسان سڑک کو، اور پھر گلے سے بھوں بھوں کی دھیمی آواز نکال کر چپی سادھ لیتا ــــــــ

صاحبو، سچ تو یہ ہے کہ اس رات کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ بس ایک چھوٹا موٹا معمولی سا فساد ہو گیا۔ معمولی سا فساد، آپ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بالکل جائز ہے۔ یہ کیا کہ چند محلے جل گئے۔ کچھ گاڑیاں پھونک دی گئیں کچھ بچے نذر آتش کر دیئے گئے۔ کچھ جوان ہلاک کر دیئے گئے۔ پھر سب کچھ معمول پر ــــ نہیں جناب ــــ اب سب کچھ ایڈونچر چاہیے ــــ مجھے، آپ کو، پولس کو، روزانہ اخبار پڑھنے والوں کو، اور ٹی وی دیکھنے والوں کو، جیسے کوئی بھونچال آتا ہے، جیسے کوئی قیامت ٹوٹتی ہے، اور سچ پوچھیے تو ــــــ نہیں صاحبو، رنجیدہ مت ہوئیے، میں واقعات سے کاٹ نہیں رہا ہوں آپ کو ــــ چاہتا ہوں کہ واقعات سمجھنے سے پہلے آپ مجھ سے

یوں واقف ہو جائیں، جیسے اس کتے سے جس سے آپ کو آگے چل کر واقف ہونا ہے۔ تو صاحبو، عام طور پر خواب دیکھنے والے حضرات کی طرح میں بھی خواب دیکھتا ہوں اور خراب بھی کیسا۔ خواب میں بم کے گولے پھوٹتے ہیں۔ ہلچل مچتی ہے۔ جتنی زیادہ ہلچل مچتی ہے، اتنی دیر تک لگتا ہے جیسے اندر سے کوئی انجانی خوشی ابل رہی ہو۔ میں مشتعل ہوتا ہوں مشتعل ہوتا ہوں اور خوش بھی ہوتا ہوں۔ اب مان لیجئے، آپ کمرے میں بیٹھے ہیں، میں بھی بیٹھا ہوں تو میری خواہش ہوتی ہے، ساری اشیاء سالم اور جامد کیوں ہیں۔ کچھ ہو۔ جیسے بھڑاک سے پنکھا گر جائے۔ بلب پھٹ جائے دیواریں ہلنے لگیں۔ آس پاس کے مکانات ملبے کے ڈھیر بن جائیں۔ مزدور جب اینٹیں توڑتے ہیں تو مجھے مزہ ملتا ہے

اچھا چلئے اب آپ کو وہ واقعہ سناتا ہوں .... اس دن .... آپ سمجھ گئے ہوں گے، مجھے مشتعل ہونے کا اچھا خاصا بہانہ مل گیا ہوگا۔ اور صاحبو، تسلیاں دینے والے تو بہت تھے مگر صاحبو، دل کی دھڑکن اتنی تیز رفتار تھی کہ ان تسلیوں کو فریم کرا کر دل کے قید خانے میں رکھنے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں بچی تھی۔ میں جس محلے میں ہوں، اس سے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اپنی ذات کا ایک اکیلا میں ہوں۔ شاید ایسے ہی موقع کے لئے میرے احباب مجھے سمجھایا کرتے تھے کہ وہ مکان چھوڑ دو کہ ہوشیاری اسی میں ہے اور آگ لگانے والی اپنی آنکھیں بھی ایسے موقع پر بے خبری میں مُند جاتی ہیں۔ ــــــ تو صاحبو! فساد ہونا طے تھا یا یوں کہئے کہ جو فضا بن رہی تھی اس نے تو یا صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ میاں بھاگنا ہو تو ابھی سے نو دو گیارہ ہو لو، اس لئے کہ فساد اس ملک کا مانسون نہ تو ہے نہیں، جس کے آنے میں شک ہو۔ پھر کیا تھا، گھر والوں کو افراتفری میں رشتہ داروں کے یہاں بھجوا کر خود اکیلا ڈٹ گیا کہ اندر اس خوف و دہشت کی فضا میں کچھ ایسا گلیمر ضرور تھا جو دیکھنا چاہتا تھا کہ آگے آگے کیا ہوتا ہے۔

اور اس رات ــــــ دو محلہ چھوڑ کر دکھن محلہ کے ہاشم بھائی بھاگے بھاگے گھر آئے، دروازہ کھٹکھٹایا

اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے،

"میاں بہت ڈھیٹ ہو چکی۔ اب بھاگ بھی چلو۔ آج کی خیر کوئی۔ کوئی جگہ ہے بھی نہیں۔ اپنے یہاں کی مسجد میں کافی لوگ چھپے ہیں۔ تم بھی نکل لو ــــــ"

میں تو نہیں، لیکن ہاشم بھائی خبر سنانے کے بعد ایسے بھاگے جیسے پیچھے کتے پڑ گئے ہوں۔ شام ہوتے ہی سڑک ایسے خاموش ہو گئی جیسے کرفیو کا اعلان ہو چکا ہو ــ آسمان کی رنگت بھی پیلی پڑ گئی تھی۔ میں سڑک پر آیا تو پائے گھر چھوڑ کر پان والے کے پاس کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ باتوں میں فساد کی بارود کی مہک اس قدر تھی کہ میں تھکا سا کمرے میں گیا۔ ایک ایک دروازہ چیک کیا۔ تالہ لگایا۔ پھر باہر نکل آیا۔ تب تک رات کے آٹھ بج چکے تھے سڑک سناٹے میں ڈوبی تھی۔ مجھے لگا، اب گھر چھوڑ دینا چاہیے۔

بس اسی خیال کے تحت میں سرپٹ دوڑ پڑا۔ ٹھیک اسی وقت سنسان سڑک پر پیچھے سے کئی لوگ دوڑتے

بھاگتے نظر آئے۔ پھر گولی چلنے کی تیز آواز ہوئی۔ پولس جیپ کا سائرن بھی بج اٹھا۔ میں اور تیز دوڑا۔ سانس جیسے جسم سے اپنا ناطہ توڑ لینے پر آمادہ تھی کہ ٹھیک اسی وقت مجھے کسی نے ہاتھوں سے پکڑ کر گلی میں کھینچ لیا۔

پاگل ہو۔ کہاں دوڑ رہے ہو۔ موت کو دعوت دے رہے ہو کیا۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ اس آدمی کو پہچانتا تھا میں۔ چھوٹے سے شہر میں رہنے کے زیادہ تر فائدوں میں سے ایک ہے کہ ہر چہرہ شناسا لگتا ہے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ شیو پوری کا چوکیدار ہے۔ اور یہ گلی، جس میں چوکیدار نے مجھے کھینچا تھا، آمنے سامنے کے چار چھ گھروں کو جوڑنے والی ایک تنگ گلی تھی، جس سے اکثر و بیشتر گزرنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ میں جب بھی ادھر سے گذرتا، ناک بند کر کے گزرتا کیوں کہ آگے کے دو مکان کے باہری حصے کا سنڈاس اسی گلی میں کھلتا تھا اور اس کی بدبو پوری گلی میں اس قدر گونجتی تھی کہ زیادہ تر لوگ اس شارٹ کٹ کے استعمال سے بھاگتے تھے۔ مگر میرا کیا تھا، آنکھیں کھولیں تو چاروں طرف بدبو کے بھبکے ہی تو تھے جنہیں سونگھتا اور محسوس کرتا ہوا مگر پھر بھی ______ چوکیدار نے مجھے اندر کر لیا پھر گیٹ چڑھا دیا ٹھیک اسی وقت پولس جیپ سائرن بجاتی ہوئی پاس سے گزر گئی۔

چوکیدار نے دھیرے سے کہا۔

"پھنس گئے۔ اب کرفیو لگ گیا ہے"۔

اس نے ایسے معنی خیز اشارہ سے میری طرف دیکھا، جیسے آنکھوں آنکھوں میں میری شرافت کے سارے کپڑے جسم سے الگ کر رہا ہو کہ میاں اب بولو۔ باہر کرفیو اور یہ تنگ بدبو دار گلی۔ کہاں جاؤ گے ___ میں نے گھوم کر دیکھا۔ ہلکے اندھیرے میں گندہ سا چیتھڑا بچھائے کوئی فقیر آرام سے ایک طرف سو رہا تھا۔ اس کے پائیتانے ایک کتے کی ڈراونی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں نے چوکیدار کی طرف گھوم کر دیکھا۔

چوکیدار بولا۔ وہ پاگل سی گلی والا فقیر ہے۔ کچھ بولتا وولتا نہیں ہے۔

کتے نے ایک بار پھر دھیرے سے بھوں کیا۔ شاید کتا بھی حالات کی نزاکت سمجھ چکا تھا۔ وہ وہاں سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ پیر دل سے الجھنے کی کوشش کی۔ میں نے سانس روک لی۔ یارب۔ کتے سے زندگی میں اتنا ڈرتا آیا تھا کہ شاید بھوت پریت سے بھی اتنا ڈر نہ لگتا ہوگا ______

چوکیدار بولا۔ یہ کتا کاٹتا نہیں ہے۔ صرف سونگھتا ہے۔

"کیوں؟"

"سونگھ کر پہچان کرتا ہے کہ اپنا آدمی ہے یا نہیں"۔

میں نے پھر پوچھا۔ کتے کو بھلا اس کی تمیز کیسے ہوتی ہے؟"

اس پر چوکیدار خاموش رہا۔ کچھ وقفہ بعد اس نے انجانے میں اپنا ڈنڈا پٹکا۔ پھر ایک دم سے چونک گیا۔ جیسے اچانک خیال آیا ہو۔ آج وہ ڈیوٹی نہیں دے سکتا۔ اور اس تنگ گلی میں سب کے سب کسی ایرادھی کی طرح پھنس گئے ہوں۔۔۔۔۔ وہ پھس پھسی سی ہنسی ہنسا۔

"کیا کہیں۔ عادت چھوٹتی نہیں نا۔"

میں چپ چاپ چلتا ہوا گیٹ تک آگیا۔

رات دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ لوہے کا گیٹ اس وقت ہمارے لئے جیل کی آہنی سلاخوں کی طرح تھا۔ سوئے ہوئے فقیر نے منہ سے عجیب آواز نکالی تھی۔ پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ کتا اب اس کے سرہانے آگیا تھا۔ اور اپنا منہ اس کے میلے کچیلے منہ کے پاس لے جاکر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھڑے کھڑے پاؤں میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے اندھیری گلی میں ذرا آگے بڑھنے کی کوشش کی تو چوکیدار کی آواز سنائی پڑی

"آگے پائخانہ بہہ رہا ہے۔ اس طرف مت جائیے۔"

کیا۔۔۔۔ مجھے اچانک ابکائی سی محسوس ہوئی۔ خوف کی شدت نے بدبو کے احساس کو اب تک مجھ سے دور رکھا تھا۔ اب مجھے شدید قسم کی بدبو محسوس ہو رہی تھی اس قدر شدید کہ ناک پھٹ رہی تھی۔۔۔۔ باہر کیسے جاؤں۔ اور سچ یہ بھی ہے کہ رات کسی بھی طرح یہاں نہیں گذار سکتا۔ کھڑے بھی نہیں رہ سکتا۔ بچھانے کے لئے بھی پاس میں کوئی چادر نہ تھی۔ اور یوں اس طرح پینٹ شرٹ پہنے، گندی گلی میں تو لیٹنے کا سوال نہیں تھا۔

اب مجھے احساس ہو رہا تھا۔ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی تھی۔ میں گھر سے بھاگا ہی کیوں؟ قیامت خیز ہولناک رات۔ ہم سے کچھ ہی دوری پر اندھیرے میں پائخانہ بہہ رہا تھا۔ کھلے سنڈاس سے بدبو کے بھبھکے آگ کے شعلوں کی طرح تیزی سے ہماری طرف لپک رہے تھے۔

کتا کھکھیایا۔ فقیر کو کھانسی اٹھی تھی۔

چوکیدار بولا۔ کرفیو رات بھر رہے گا۔ چلو سونے کی کوشش کرو۔

اس نے فرش سے ڈنڈے کو سرہانے رکھا اور آرام سے ایسے لیٹ گیا کہ اچھے بھلے لوگ گھر کے آرام دہ بستروں پر بھی نہیں لیٹتے ہوں گے۔ اس نے ایسے بے فکری سے آنکھیں موند لیں جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ کتا فقیر کے پاس سے اٹھا۔ چوکیدار کے پاس آکر دم ہلانے لگا۔ چوکیدار نے دھیرے سے ہوں ہاں کر کے کتے کو بھگایا۔ کتا اب وہاں سے ہو کر میرے پیر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

اُف۔ معاذ اللہ۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور جیسے ٹھنڈ لہر تلوار کی طرح میرے بدن کو چیرتی چلی گئی۔ وہ آنکھیں، میں جانتا ہوں۔ آپ یقین نہیں کریں گے۔ اور آپ یقین کریں بھی تو کیسے، جبکہ خود پہلی بار مجھے

کبھی یقین نہیں آیا۔ ان میں جنگلی جانوروں یا جبلّت جیسی کوئی چمک نہیں تھی، خلاف توقع وہاں انسانی نفرت موجود تھی۔ ہاں شدید انسانی نفرت۔ کتے نے منہ پھیر لیا۔ اور اپنی نفرت میری آنکھوں میں اتار کر چپ چاپ آگے چلتا بنا۔

میں نے پھر سوچا۔ کیا میں یہاں لیٹ سکتا ہوں۔ نہیں۔ تو کیوں نہیں لیٹ سکتا۔ اخلاقیات کے سارے درس، یہاں، اس کرفیو زدہ رات کی آغوش میں، اس تنگ بدبودار گلی میں۔ چپکے چپکے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ پیٹ میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا، جاتے وقت خواہش ہوئی تھی کم از کم بریڈ اور سلائس ہی کھالوں، موقع بعد میں ملے نہ ملے۔ مگر بھوک ایسے موقع پر، سنسان سڑک پر پولس جیپ کی طرح بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

اچانک تیز بدبو کا بھبھکا اٹھا تھا۔ پچھلے دروازے سے ہوا کے جھونکے اس طرح اندر آگئے تھے، جیسے چھوٹے بچے، تھوڑے سے کھلے گیٹ سے باہر جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ نہیں مجھے سونا چاہئے۔ مگر کہاں۔۔۔۔ نیند بہت ضروری ہے پیارے۔۔۔۔ مگر۔ کتا مجھے گھور رہا تھا، اب مجھے احساس ہوا، یہ بدبو کتے کے بدن سے اٹھی تھی اور میرے بدن میں منتقل ہو رہی تھی۔

کئی ماہ ہوئے، میری بیوی نے کہا تھا۔ گھر میں سب چیزیں موجود ہیں۔ صرف ٹ۔ وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ میرے سمجھنے کا انتظار کرتی رہی۔ ایک ضروری اسٹیٹس سمبل۔ کتا۔ السیشن ہو یا پھر بھورا جھبرا معصوم سا کتا۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔ میں نے غصّے میں بیوی کو ڈانٹا۔ بکو مت۔ کتے ذلیل ہوتے ہیں۔"
انسانوں سے بھی۔ بیوی اردو افسانہ لکھنے والے واہیات ادیبوں کی طرح جیسے فلسفے کا توپ داغنے پر آمادہ تھی۔

ہاں۔ اس سے بھی زیادہ۔ میرا جواب تھا۔

مجھے لگا، کتا میری آنکھوں میں اپنے لئے نفرت کی کہانی کو تلاش کر رہا ہو۔

میں نے غصّے میں کہا۔ کم بخت ڈرامت، میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا اپنی بیوی سے۔

فقیر اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنے کان کھجلا رہا تھا۔ پھر ٹٹول کر رلائی میں چھپائی ہوئی روٹی اس نے نکالی۔ روٹی کا سوکھا ٹکرا توڑ کر اس نے اپنے منہ میں ڈالا میں نے دیکھا۔ وہ میری طرف بھی ایسا ہی ایک چھوٹا سا ٹکرا بڑھا رہا تھا۔

اس بار جب سنسان سڑک سے پولس جیپ سائرن بجاتی ہوئی گزری تو میں نے حواس بحال کئے، سوچا، آواز دے کر پولس کو پکاروں۔ بتاؤں، کہ انجانے میں، میں کیسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے یقین تھا،

پولس والے کسی محفوظ مقام پر مجھے ضرور پہنچا دیں گے۔

چوکیدار نے چلا کر کہا۔ گیٹ تک جاؤ گے تو پولس پکڑ لے گی،،

میری گھبراہٹ دیکھ کر اس نے بے سرے انداز میں ہنسنا شروع کر دیا۔

صاحبو، مجھے کہنے دیجئے۔ آج اور اب سے پہلے میں صرف سنتا آیا تھا کہ نیند تو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے۔ پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ سوکھی روٹی کے ٹکرے ڈکار کر فقیر لمبی تان کر سو گیا تھا۔ چوکیدار اب پھر سے سو گیا تھا اور خراٹے بھر رہا تھا۔ کتے نے بھی ادھر ادھر گھوم کر تھوڑی سی جگہ تھیا لی تھی۔ نیند ضروری ہے۔ بدبو کا کیا ہے۔ بدبو تو جنم سے سونگھتا رہا ہوں۔ یہاں وہاں آس پاس چاروں طرف۔ میں نے خود کو سمجھایا اور وہیں، ایک طرف اپنے لیے جگہ بنا کر اوندھا، ہو گیا۔

اور صاحبو، سچ کہتا ہوں، مانیں نہ مانیں مجھے نیند آگئی۔ اور نیند بھی کم بخت ایسی قاتل کہ کچھ بھی یاد نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں اور کن لوگوں کے بیچ ہوں۔ کہنا چاہیئے میں گھوڑے بیچ کر سویا۔ اور میری ظالم نیند اس وقت لوٹی جب کرفیو میں ڈھیل کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہلکی سی آنکھیں چوندھیائیں تو میں سمجھ گیا، اب اس جگہ میں تنہا بچ گیا ہوں۔ فقیر شاید پو پھٹتے ہی کہیں نکل گیا۔ کتا بھی اپنے ساتھیوں کی تلاش میں باہر جا چکا تھا۔ چوکیدار بھی غائب تھا۔ گیٹ کھل گیا تھا، گو دھوپ ابھی نہیں نکلی تھی لیکن ساری رات کرفیو کے بعد والا سویرا تھا، جس کے ہٹتے ہی ڈر اور خوف کو ممگا ڈر کے بچے کی طرح سینے سے چمٹائے لوگ سڑکوں پر آنکلے تھے۔ میں نے انگڑائی لے کر اٹھنا چاہا تو ایسے چونک گیا جیسے ہاتھ اچانک کسی دھار دار چیز پر پڑ گیا ہو۔ یہ بوٹ تھا اور بہر حال میں اسے خوب پہچانتا تھا۔ یہ سرکاری بوٹ تھا۔ اور جو آدمی اسے پہنے تھا وہ بغور مجھے اور میرے قیمتی لباس کو دیکھ رہا تھا۔

"چلو"————

میں نے اٹھنے کی کوشش کی، بولنا چاہا مگر۔ دفعتاً چونک گیا۔ میرے نرخرے سے انسان کی جگہ کتے کی آواز نکل رہی تھی۔

سرکاری آدمی ایک دم سے بوکھلا اٹھا————

"کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟ اس جگہ ———— اس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ زہر بھرا ہوا تھا۔" جانتے نہیں شہر میں کرفیو لگا ہے"۔ "دیکھا'..... میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ میں ایک شریف شہری ہوں۔ اس ملک کا ایک معزز شہری۔ میں یہاں قریب میں ہی آباد ہوں اور اچانک فساد چھڑ جانے کی وجہ سے محفوظ مقام کی تلاش میں، بدقسمتی سے میں اس جگہ پھنس گیا۔ مگر یہ کیا۔ میرے نرخرے سے لگاتار کتے کے بھونکنے کی آواز نکل رہی تھی۔

"تم ۔۔۔۔ تم ہو کون ؟"
سرکاری آدمی اب کچھ غصّے اور شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا
"میں ۔۔۔۔۔ " کتا پھر گھگھیایا۔
"سب پتہ چل جائے گا بچو۔ چلو تھانے" ـــــ
مجھے تھانے لے جا کر اس نے اپنے سے سینئر باس کو سیلوٹ مارا پھر دھیرے دھیرے کچھ پھسپھسانے لگا۔ میں نے کان لگایا تو پتہ چلا وہ میرے بارے میں ہی بول رہا تھا۔
"بس سر۔ یہی آدمی ہے۔ نہیں سر، مجھے شک نہیں یقین ہے اس کے کپڑے دیکھئے، سر۔ شہر میں جو کچھ بھی ہوا، میرا یقین کیجئے، سر، یہی آدمی ہے۔ یہ آدمی مجھے مشتبہ حالت میں اس جگہ ملا۔ نہیں سر، میرا منہ مت کھلوائیے اب میں کیا بتاؤں۔ نہیں سر، میں ٹھیک بتا نہیں سکتا۔ نہیں۔ آپ سننا ہی چاہتے ہیں سر تو سنئے، وہاں سنڈاس کھلے ہوئے تھے اور پتلے پاخانے کی دھار بہہ رہی تھی۔ اور یہ آدمی ایسی بے فکری کی نیند سویا تھا کہ۔۔۔
ذرا ملاحظہ فرمایئے سر یہ آدمی ۔۔۔۔ اس کا حلیہ ۔۔۔۔۔ اس کا لباس ۔۔۔۔ اس کی آواز ـــــ ہاں تو جی ـ
اب تم بتاؤ۔ کون ہو تم؟ دیکھو سیدھے سادھے سچ سچ بتا دو"
اب وہ میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
میں نے منہ کھولا۔ اور کیا بتاؤں ـــــ مجھے خوشی سے زیادہ حیرت اور حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی کہ میں، اپنی ہی آواز میں ہمکلام تھا۔
"میں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں"
آفیسر نے چونک کر اپنے جونیئر کو دیکھا ۔۔۔۔
"تم تو کہتے تھے کہ یہ ۔۔۔۔۔"
یس سر۔ میں سو فیصد سچ کہتا ہوں"
"اگر یہ سچ ہے تو اب ۔۔۔۔۔ یعنی تم بھی دیکھ رہے ہو ۔۔۔۔"
"میں ایک شریف آدمی ہوں سر۔ اور یہ مجھ پر تہمت ہے، الزام ہے۔"
سینئر کے لہجے میں غصّہ تھا ـــــ شٹ اپ، یہ تو عام انسانوں کی طرح باتیں کر رہا ہے۔
جونیئر نے ایک زور کا چانٹا میرے گال پر لگایا کہ اس وقت اسے میرے منہ سے کتے والی آواز کی زیادہ ضرورت تھی۔ مجھے غصّہ آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی اس طرح کی بے عزتی برداشت نہیں کی تھی۔ میں نے دیکھا، جونیئر سینئر دھیرے دھیرے آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے ـــــ میں نے انہیں اپنی طرف سے مطمئن کرنے

کے لیے دوبارہ الفاظ جوڑے۔ مگر یہ کیا۔ وہ زخرے سے نکلتی ہوئی کتے کی آواز۔

جونیئر خوفزدہ ہو کر بولا۔ دیکھئے سر..... دیکھا نا....

سینئر کی نظریں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔

"میں .... میں ٹھیک ہوں سر" مجھے خود تعجب تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"لو، اب تو یہ پھر آدمی کی طرح بولنے لگا"

"مگر یہ پہلے کتے کی طرح بولا تھا اور آپ نے بھی آواز سنی تھی" جونیئر زور دے کر بولا۔

ہاں سنی تو تھی مگر اب ...

جونیئر سینئر کے کان میں دھیرے سے پھسپھسایا، نہیں سر، آپ غور کیجئے۔ غور کیجئے۔ میں کہہ رہا ہوں نا یہ جو ہو رہا ہے اس وقت پورے ملک میں۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے سر۔ ہنڈریڈ پرسنٹ سر۔ مجھے یقین ہے۔ اور۔ کیا صرف دو ہاتھ دو پیر کا ہونا ہی انسان ہونا ہے۔ یس سر، وہاں وہ پرانے زمانے کا سنڈا اس آپ نہیں جانتے سر۔ وہ جو ہو رہا ہے... پورے ملک میں..... یہی آدمی ہے سر۔"

وہ جو بھی کہنا چاہتا ہو مگر اس کے لئے شاید اس کے پاس موزوں الفاظ نہیں تھے۔ غصے میں وہ اپنے بال نوچ رہا تھا۔ اس نے پھر سر سہلایا۔ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ سارے فساد کے پیچھے بس اس کتے کا۔ نہیں سر۔ میرا اعتراض یہی ہے۔ آپ اسے انسان کیوں کہتے ہیں۔ ایک کتے کو انسان۔ اس کی صرف شکل انسانوں جیسی ہے۔ اندر سے یہ....."

اور ـــــ اس کے بعد صاحبو..... میں سچ کہتا ہوں۔ نہیں، آپ کو یقین کرنا پڑے گا۔ اور اب تک جو کہانی میں نے آپ کو سنائی وہ اس واقعہ کے سامنے بہت معمولی حیثیت رکھتی ہے۔ جو میں اب آپ کو سنانے جا رہا ہوں۔

جس وقت جونیئر سینئر افسر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ساڑھے سات بجے کا وقت ہوگا۔ دھوپ آسمانوں کو چھیدتی ہوئی کمرے میں گھس آئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت ایک کانسٹبل ایک پٹے والے کتے کو، جو کہ زنجیر سے بندھا تھا۔ کھینچتا ہوا اندر لے کر چلا آیا۔

اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھ پاتے، کانسٹبل چلا کر بولا، سر، چمتکار ہو گا۔ انہونی ہو گئی۔

سینئر غصے میں دہاڑا۔ بکو کیا بکنا چاہتے ہو۔

"سر۔ اس کتے کی آواز سنئے۔ جی ہاں سر۔ غور سے سنئے۔"

اور ـــ بالکل سچ کہتا ہوں صاحبو۔ وہ کتا انسانی آواز میں بول رہا تھا۔ یہ شرافت کا زمانہ

نہیں رہا۔ سراسر ظلم ہے۔ زیادتی ہے۔ آپ لوگ کسی بھی شریف کتے کو پکڑ کر اندر بند کر لیتے ہیں۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔

کتا بڑبڑا رہا تھا۔ سینئر کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ جونیئر پر غشی طاری تھی۔ اور تب سینئر نے دھیرے سے جونیئر کے کندھے تھپتھپائے۔ بولا سنو... غور سے سنو۔ ایسا ہوتا ہے.... ایک خاص مدت میں.. جب ہم ارتقا پذیر ہوتے ہیں... سمجھ رہے ہونا... ارتقا پذیر ——— تنزلی کے راستے بھی یہیں سے پھوٹتے ہیں، سمجھ رہے ہونا..... یعنی اگر کچھ بدل جائے۔ ہم تم ہو جائیں، تم ہم..... فیشن سے لے کر اخلاق بات..... یعنی کتا انسان ہو جائے انسان..... ایک خاص وقت میں.... یعنی یہ ارتقاء کا بہت معمولی سا دستور ہے..... تم سمجھ رہے ہونا.... دراصل زمین اپنے محور سے ہٹ رہی ہے۔ نیا پرانا جی تب۔ یعنی.... میں جو کہہ رہا ہوں.... تم سمجھ....،،

سینئر ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر صاحبو، جو بات اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ ناقابل یقین ہے۔ سینئر بول ضرور رہا تھا مگر۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ بولنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا مگر اس کے نرخرے سے مستقل کتوں جیسی آواز نکل رہی تھی اور سب چونک کر حیرت سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔

●●

آفسانہ

شکستگی

علی امام نقوی

54/103, Naya Nagar C.H.Society
Mira Road (East) Thane - 401107

اُس روز بھی سنڈے تھا اور ظہیر نے وی سی پی پر امیتابھ بچن کی فلم لگا رکھی تھی۔ ظہر کی نماز کے بعد متفکر باپ گھر میں داخل ہوا تب بھی رنگین ٹیلی ویژن پر امیتابھ بچن ہاتھوں میں ترشول لئے اپنے دشمنوں سے مقابلہ کر رہا تھا، داخلی دروازے کی چٹخنی لگانے کے بعد اس نے بیوی سے کہا!

"اس میں تالا لگا دو"

"دکان بند کر دی؟ تردد کا ہلکا سا سایہ بیوی کے چہرے پر بھی تھا

"ہاں"

"اچھا کیا، دل ہول رہا ہے۔ کوئی ...... کوئی خبر؟

شوہر نے غور سے جیون ساتھی کے سراپے پر نگاہ ڈالی، پھر جوان بیٹیوں کو دیکھا جو سہمی ہوئی ان ہی دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ بیوی نے لپک کر ریک پر سے تالا اٹھایا اور شوہر کی ہدایت پر عمل کیا۔

"میں نے پوچھا تھا۔ کوئی خبر؟

"ادھر ادھر سے سنی ..... وہ کامیاب ہو گئے

"کیا؟

"ہاں! کچھ لوگوں نے بی بی سی پر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے"

مضمحل قدموں کے ساتھ وہ بیٹھک میں صوفے کے گوشے میں دھنس گیا۔ ظہیر اپنی ہی دنیا میں مگن تھا۔

کرتا ہو، اور مجبور ہیں گے تو یہ بھی دیکھ رہا ہو کہ گھر کی مغربی دیوار پر ایک منقش چوبی ریک پر قرآن مجید اور مصلیٰ پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اور ان کے نیچے ایک میخ پر وہ مالا آویزاں ہے جو ظہیر کے ابّو کو ان کے ایک ہندو دوست نے دبئی سے رخصتی کے وقت تحفہ میں پیش کی تھی۔

عشاء بعد آٹھ بجکر چالیس منٹ پر دوردرشن کی نیوز ریڈر کی زبانی سماچار سن کر سب کے منہ اتر گئے۔ سیکولر بھارت میں ایسا بھی ہوگا۔ ماں، باپ اور بہنوں کے اترے ہوئے چہرے دیکھتے ہوئے ظہیر نے بھی گھر میں چھائی ہوئی خاموشی کو محسوس کیا۔ نیوز بلیٹن اس نے بھی سنا تھا۔ مگر بے دلی سے، اس کی ساری توجہ تو اس فلم کے کلائمکس نے اپنی طرف مبذول کر لی تھی، جس کے دوران اس کے ابّو کی آمد پر ٹی، وی بند کر دیا گیا تھا۔ عام دنوں میں بھی نیوز کے وقت اسے وی، سی، پی چلانے کی اجازت نہ تھی، اور یوں بھی اسے خبروں سے دلچسپی اس درجہ سے نہ تھی کہ جس زبان میں وہ سنائی جاتی ہیں، اس کا سمجھنا ظہیر کے لئے ایک سنگین مسئلہ تھا۔ اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے ظہیر نے محسوس کیا کہ سناٹا گھر ہی میں نہیں باہر بھی بول رہا ہے اور اس احساس کے پیدا ہوتے ہی اس نے اٹھ کر وی، سی، پی میں موجود کیسٹ کو پیش کر دیا۔

"بھاگتا کہاں ہے حرام زادے؟"

سب ہی چونک پڑے، ظہیر کے ابّو نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا، پھر ٹی، وی کے اسکرین پر نگاہیں جمائیں۔ امیتابھ کے ہاتھوں میں ترشول تھا، اور دشمن اس کی زد پہ تھا۔ پس منظر کی موسیقی ایک عجیب سی ہیبت پیدا کر رہی تھی، ظہیر کے علاوہ گھر کے تمام افراد خوف کی لہر کو اپنی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ ادھر امیتابھ کا ترشول دشمن کے پیٹ میں پیوست ہو چکا تھا۔

"وہ مارا ـــ ظہیر نے اچھلتے ہوئے تالی بجائی اور چھوٹی باجی سے بولا

"دیکھا؟ میرے اینگری ینگ مین کو۔ سالے کو ختم کر دیا۔ وہ ہر ولن کو اسی طرح ختم کرتا ہے کسی سے ڈرتا نہیں باجی۔ ہر... ہر دکھی کی مدد کرتا ہے وہ He has daring

باپ کے اشارے پر بڑی بیٹی نے ٹی، وی بند کیا تو ظہیر نے احتجاجاً کہا

"تھوڑی سی رہ گئی، چلنے دو نا باجی

"چپ رہو

"کیوں ابّو؟

"تم سے کہا چپ رہو بس ـــ خاموش رہو

" پر ۔۔۔ کیوں ؟

" بتاؤں تجھے

اس کے ابّو گرجے، دس سال کا ظہیر اپنے ابّو کے طرز تکلم پر حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا
اُدھر اس کے ابّو کا ذہن اس سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا جو ان کے چہیتے بیٹے نے کیا تھا۔
ان کا لاڈلا بیٹا نیوز بلیٹن کے سیاق و سباق سے قطعی ناواقف تھا۔

" بتادو اسے ۔۔۔۔ بیوی نے آہستہ سے شوہر کو مخاطب کیا

" نہیں ۔ کوئی فائدہ نہیں، جو بھی ہوا ۔ برا ہوا، بہت بُرا ۔ اور کل کیا ہوگا ؟

" کیا ہوگا ؟ ۔۔۔ بیوی کی آواز لرز رہی تھی

" احتجاج ۔ شاید ۔ اکّا دکّا، جھڑپ بھی ہو ۔ جا، بجا ۔ پولس بندوبست ہے ۔ ایسا لگتا ہے ۔ ہم سے احتجاج کا حق ہی چھین لیا جائے گا ۔ اور پھر، جو ہوگا، اس کے تصوّر سے گھبرا رہا ہوں

" فساد ؟

بیوی کا سوال تھا یا آنے والے کل کی پیشین گوئی، اس نے غور سے بیوی کو دیکھا ۔ پھر جوان بچیوں کو اور بے حد شکست خوردہ لہجہ میں اس نے جواب میں ہنکاری بھری

" فساد

" فساد یعنی کیا ؟ انگلش میں بولو، انگلش میں

ظہیر کے فرمائشی استفسار پر سب ہی نے اس پر اپنی نظریں مرکوز کردیں ۔ چند لمحوں بعد ماں باپ نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر ظہیر کے ابّو نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا

" RIOT

" پر ۔۔۔ رائٹ کیوں ہوگا ؟

پھر وہی سوال باپ کے سامنے آن کھڑا تھا، جس کا جواب وہ زوجہ کو دے چکے تھے لیکن ظہیر کو کیسے سمجھاتے ؟ کچھ تخریب کاروں نے منصوبہ بند طریقے سے ایک مسجد شہید کردی ہے ۔ قانون، انصاف اور ملک کے کروڑہا افراد، پانچ سات کروڑ سر پھرے دہشت گردوں کے سامنے بے بس ہوگئے ۔
آخر کس طرح سمجھاتے وہ ظہیر کو ؟ سچ کیا تھا ؟ سچ کیا ہے ؟ وہ تو خود بھی نہیں جانتے تھے کہ جس عبادت گاہ کو مسمار کیا گیا وہ اسی مغل بادشاہ نے بنوائی تھی، جس کے نام موسوم تھی ؟ ظہیر کے مختصر سے سوال کا جواب کسی حد تک اس کی بہنوں کے پاس تھا ۔ کیوں کہ دونوں ہائی اسکول تک بڑھ چکی تھیں اور

دونوں ہی پابندی سے اخبار بینی کی عادی بھی تھیں۔

رات کا کچھ حصّہ سسکنے کے عالم میں گذرا۔ فکرمند ذہن نیند کی پناہ گاہوں میں داخل ہوئے۔ دوسرے دن کا سورج اپنی کرنوں کے ساتھ کئی ہولناک خبریں لے کر طلوع ہوا۔ مشینی شہر کی زندگی بظاہر حسب معمول تھی۔ مگر ایک خوف بچاسی فیصد دلوں میں کنڈلی رمائے بیٹھا تھا۔ لوگ، ایشور، اللہ اور جیسس کو یاد کرتے رہے۔ دن کے صرف دو پہر گذرے تھے کہ دو آبے کی کراہیں، پورے ملک پر محیط ہوگئیں۔ ہنگامی صورت حال کی بنا پر دفاتر بند ہوئے، حفظ ماتقدم کے طور پر والدین نے بچوں کو اسکول ہی نہیں بھیجا تھا۔ سات، آٹھ لاکھ بلوائیوں نے بیالیس لاکھ شہریوں کو بے بسی کی کیفیت میں مبتلا کردیا۔ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شور مچایا جانے لگا۔

"گھیرو، مارو،

"سالا ـ لانڈیا ہے۔

"مسلم تیرے دو استھان

"پاکستان اور قبرستان

جواب میں اللہ اکبر کے نعرے بھی گونجے، گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے گئے، پھر ان پہ کلہاڑیاں چلنے لگیں۔ ظہیر گرل لگی کھڑکی کی اک ذراسی درز سے قتل و غارتگری دیکھ کر اندر ہی اندر سہمتا رہا اور اس کا معصوم ذہن بار بار ایک سوال کرتا رہا۔

" دہیئر از اینگری ینگ مین؟ امیتابھ بچن کیوں نہیں آتا؟ کیوں نہیں آتا؟

وہ چونکا تو اس پل، جب اس کے ابّو نے اسے پکارا، اس نے پلٹ کر دیکھا، سفید بے داغ چادر پر ماں، باپ اور بہنیں مصلّے کو ترچھا بچھا کر نماز کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ ابّو کے کہنے پر اس نے بھی وضو کیا اور بہنوں کے قریب کھڑے ہوکر وہی سب کیا جو بزرگ کر رہے تھے، نمازوں کا سلسلہ ختم ہوا تو چٹکیوں سے تسبیحوں کے منکے گرنے لگے۔ ظہیر نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے لئے کوئی تسبیح نہ تھی، معًا اس کی نگاہ مغربی دیوار پر نصب ریک کے نیچے آویزاں مالا پر پڑ گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے مالا اٹھائی۔ دریچے کی درز سے باہر انسانی چیخ و پکار داخل ہوئی تو ظہیر نے سوچا کہ امیتابھ بچن کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آتا۔ کتنی مار کاٹ ہو رہی ہے پھر بھی وہ نہیں آرہا۔

"یااللہ، یااللہ، یااللہ

ماں، باپ اور بہنوں کی آوازیں سن کر وہ پلٹا اور اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ نگاہوں نے بہنوں کی چیخوں کو اپنے حصار میں لیا اور زبان ان کلمات کو دہرانے لگی، جن کا ورد ہو رہا تھا

"یا اللہ، یا اللہ، یا رحمٰن و یا رحیم، یا ارحم الراحمین

اس کے کانوں میں مسلسل امی، ابو اور بہنوں کی آوازیں پہنچ رہی تھیں۔ خود وہ بھی رک رک کر، وہی سب دہرا رہا تھا۔ ایک، دو، دس، بیس مرتبہ اور پھر اسے ایک دم سے درز سے دیکھا ہوا منظر یاد آگیا، وہ بھول گیا کہ اب تک وہ کیا پڑھ رہا تھا۔ اب جو اس کے منہ سے آواز نکلی تو کچھ اور ہی تھی۔

"یا اللہ، یا اللہ۔ رائٹ، رائٹ، یا رحمٰن، چاقو، ننگا، خون، زنجیر زنجیر زنجیر، یا اللہ، یا اللہ، وہ گر گیا، وہ مارا، وہ تڑپ رہا ہے۔ وہ آنٹی کو ننگا کر دیا، یا اللہ، یا اللہ، امیتابھ، امیتابھ، کم آن امیتابھ، کم آن، کم آن ڈیر۔ یا اللہ، خون، مارو، پکڑو، وہ آنٹی، ننگی آنٹی۔ اُف، دھیر آر یو امیتابھ؟ کم آن۔

سب نے اس کی آواز سنی تھی، وہ سب ہی چپ ہو گئے تھے۔ ماں، باپ اور بہنیں سب نے پہلے تو ایک دوسرے کو دیکھا، پھر ظہیر پر سب کی نگاہیں جم گئیں جو آنکھیں بند کئے ورد کر رہا تھا اور.....

اور پھر گھر والوں کی توجہ ان صداؤں پر مبذول ہو گئیں جو ظہیر کے ورد پر غالب آچکی تھیں۔ کوئی وزنی چیز ان کے لوہے کے دروازے پر ماری جا رہی تھی۔ بچیاں ڈر کر کھڑی ہو گئیں۔ ماں لرزنے لگی، باپ نے سب کو دلاسا دیا اور دروازے کے سامنے پہنچے۔ دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ لوہے کے دروازہ پر پولس والے رائفل کے بٹ مارتے ہوئے گالیاں بک رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ایک نے دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ ابھی وہ غور و فکر کی منزل ہی میں تھا کہ دوسری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اے مادر ...... لانڈیا۔ دروازہ کھول

"نہیں کھولے گا تو جا آئی جی ......

"ہر ہر مہادیو۔ مار۔ رے۔ سنگارے

ایک فائر ہوا۔ گولی اس کے بازو کو چھید گئی۔ ایک دم سے وہ زمین پہ گرا۔ تکلیف کی انتہائی اذیت کو محسوس کرتے اس کے ذہن نے سوچا۔ ہندو مسلم فساد تو ہماری قومی زندگی کا معمول بن چکے تھے۔ معمول بھی کیوں؟ ہماری شناخت پر ..... پر اب پولس بھی بلوائیوں کے ساتھ ہو گئی ہے۔ ایک نگاہ شانے سے بہتے خون پر ڈالنے کے بعد اس نے دیکھا، پولس کے جوان لوہے کی راڈ کے ذریعہ گرل توڑنے کی کوشش کر رہے تھے، پہلے ایک آہنی مینول ٹوٹ کر گرا، پھر دوسرا ......

بیوی نے شوہر کی واپسی میں تاخیر کو محسوس کیا تو راہداری کی طرف بڑھی۔ شوہر کو زخمی حالت میں دیکھتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ بوکھلا کر پلٹی۔ ظہیر کو کھدیڑتے ہوئے پلنگ کے نیچے چھپایا، پھر شوہر کی طرف بڑھی، ایک گولی پھر چلی، شوہر کی چیخ بلند ہوئی۔ دروازہ کھلا اور پولیس والے اندر گھس گئے۔ سہمی لرزتی تین مہیلاؤں کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں شیطان ناچنے لگا۔ رائفل تھامے ایک ہاتھ اٹھا ہوا اور دوسرے ہی لمحہ رائفل کا بٹ ماں کے منہ پہ پڑا۔ دوسرے سپاہیوں نے جوان بچیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا کہ فرش پر بچھی سفید چادر بھیگ چکی ہے۔ یکے بعد دیگرے باقی کے بٹ، جوان لڑکیوں کی چھاتیوں پر پڑے۔ ایک لہرا کر ماں پہ جا پڑی اور دوسری تیورا کے موری میں گری، اور اس کے بعد...

دس پندرہ منٹوں بعد جو کچھ لے جانا ممکن تھا وہ انہوں نے اٹھایا۔ باقی کے سامان کو انہوں نے بندوق کے کندوں سے توڑا، اور گھر سے نکل گئے۔

گھر میں سناٹا محسوس کرتے ہی سہمے ہوئے ظہیر نے صندوق سرکانے کے بعد اک ذرا سا سر باہر نکالا۔ ماں کا خون بھرا چہرہ دیکھا۔ بہنوں کو ادھر ادھر نیم برہنہ حالت میں پایا تو آہستہ سے باہر نکل آیا۔ مالا اب بھی اس کے دائیں ہاتھ میں تھی۔ منکے گر رہے تھے۔

۔ خون، خون، امی، باجی، بجیا، ن ... ن .... بجیا

ورد کرتے کرتے ہی وہ راہداری میں آیا۔ ابو کی لاش کو دیکھا۔ شانے اور دل کے مقام پر سوراخ دیکھنے کے بعد، آس پاس زمین پہ رنگ بدلتے خون پہ نگاہ پڑتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا، جوں ہی سنبھلنے کی خاطر اس نے دیوار کا سہارا لیا تو اس کے حافظے میں بسے مثالی کردار نے سر ابھارا۔ کسی طرح کمرہ میں پہنچنے کے بعد ایک بار پھر اس نے ماں اور بہنوں کو دیکھا اور اپنی پوری قوت سے چیخا۔

"اینگری ینگ مین، دھیر آر یو؟ کم اینڈ لک، لک، لک

دیکھ، دیکھ کی گردان اس وقت تھم گئی، جب اس کی نگاہ ٹیلی ویژن کے ٹوٹے ہوئے اسکرین پہ پڑی تھی۔

انیس رفیع پر گوشہ

'دستک' کے لئے انیس رفیع پر گوشہ زیر ترتیب ہے، اہل قلم حضرات سے مضامین مطلوب ہیں۔

(ع۔ش)

افسانہ

ایک اور وہ

صغیر رحمانی
Begumpur. Ara - 80231
(Bihar)

اور اس نے بے تابو ہوکر سارے دروازے کھول دیئے۔ جب اسے پیاس کی شدت محسوس ہوئی تو اس نے ٹھنڈے پانی کی پوری بوتل حلق میں انڈیل لی اور شاور چلا کر اس کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ اور اس کے سارے کپڑے بھیگ گئے تو وہ انہیں ایک ایک کرکے جسم سے الگ کرنے لگی۔ اور جب ایک دھاگا بھی نہ بچا تو وہ آئینے کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ اسے شروع سے اپنی کمر کی کٹاؤ پسند ہے۔ ایک خاص مرکز سے اس کی مٹی مختصر ہونے لگی ہے اور ایک خاص مرکز سے ایک خاص مقدار میں بڑھنے لگی ہے۔ گویا جس وقت وہ چاک پر چڑھی تھی خمار کی غنودگی میں اس کے خالق کے ہاتھ وہاں کس گئے ہوں گے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے پورے بدن کی رنگت بدلنے لگی ہے۔ اس نے ناف کے نیچے ہاتھ پھیرا تو جیسے نیلا سمندر ہاتھ میں آگیا اس نے تڑپ کر پاؤش کا ریزر اٹھالیا اور بڑی بے دردی سے اس انگ کو زخمی کرنے لگی جس نے سمندر پینے کی جستجو کی تھی۔ کچھ لمحہ درد میں تڑپنے کے بعد وہ شانت ہوگئی لیکن اسے لگ رہا تھا ماہواری کے کپڑے کی طرح اب بھی کوئی چپچپی اور غلیظ شئے اس کے اندر کہیں چپکی ہے۔

کیا اس نے اسے پوری طرح حاصل کرلیا ہے ـــــ؟ شک کے کیڑے کلبلاتے تو وہ بے چین ہو اٹھتی۔

"وہ" اپنے حریف کے مقابل نہیں آنا چاہتا تھا! اس کی غیر موجودگی میں اس کے اندر داخل ہوتا۔ "ہائے سویٹ ہارٹ" ایک عجیب مقناطیسی کشش ہوتی اس کی آوازیں، جیسے کہیں دور گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کی لامتناہی پرواز کا محض ایک پڑاؤ بھر ہے۔ لیکن یہاں ٹھہر کر وہ کس قدر سرشار ہوتی۔ اس کے لمس کی حرارت اس کے جسم کے سنسان جزیرے میں بوند بوند ٹپکتی تو اس کی روح کی سرسبز وادیوں میں دھواں سا اٹھنے لگتا۔

ور اس کے صندلی بدن پر اس کی انگلیوں کے سانپ رینگتے تو وہ بے ساختہ اکڑ جاتی۔ مگر اس سے بھی کیا ہوتا ہے زبان انگارے کو چاٹنے سے کب باز رہتی ہے حقیقی لذت کا یہ لمحہ انہیں اسی طرح اپنی گرفت میں لے لیتا جیسے سجدے میں گرا بندہ صرف اپنے معبود کو اپنے سامنے محسوس کرتا ہے اور اپنے کو سمیٹنے کی کوشش میں اس حد کو پار کر جاتا ہے جہاں اس کی خودی زائل ہو کر رہ جاتی ہے اور منزل کا ایک ایک زینہ بڑے انہماک سے عبور کرتے ہوئے ایک نقطے پر پہنچ کر وہ مرکوز ہو جاتا ہے جہاں دوسرا کچھ نہیں رہ جاتا لیکن اس نقطے کو پانے میں ان دروازوں کا بڑا دخل ہوتا ہے جو انسانی رنگ محل میں موجود ہیں۔ اور جنہیں بند کر کے ہی اس مقام کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک بھی دروازہ وارہ گیا تو وہ لذت نہیں میسر آنے والی۔ اور یہی لمحہ سخت امتحان کا لمحہ ہوتا ہے محسوسات کے اس بھنور میں جب وہ غوطے لگاتی تو اسی امتحان سے دوچار ہوتی۔

وہ جائے نماز کی طرح بچھ جاتی تو وہ سجدے میں گر جاتا۔ اور وہ جیسے ایک ایک دروازے کو مقفل کرتی اسے محسوس ہوتا کہ اس کی منزل کے سامنے سے دھند لکا بتدریج چھٹتا جا رہا ہو۔ اور آخری دروازہ بند ہونے تک۔۔۔۔ عبادت کی اس گھڑی میں اس کی والہانہ سپردگی جو سفر طے کرتی ہے بظاہر اپنے پیچھے کوئی نشان تو نہیں چھوڑتی مگر جانے کیوں اسے ایک خلاء کا احساس ہوتا۔ اس کا سفر مکمل ہوتا ہے یا نہیں یہ وہ نہیں جانتی۔ اسے صرف اتنا احساس رہتا ہے کہ اس نے سمندر کو جذب کرنے میں کچھ قطرے باقی چھوڑ دیئے ہیں۔ پھر اس کی آنکھوں کی مچھلیاں تیرتے تیرتے ڈوبنے لگتیں تو وہ اپنے جسم کو ڈارمیٹری میں بغیر برف کی رکھی لاش سی ڈھیلی چھوڑ دیتی۔

ایلیٹ سوسائٹی کی زندگی کا ایک الگ انداز ہوتا ہے۔ جہاں کچھ بھی برا نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں فرد کو ذہنی اور جسمانی آزادی میسّر ہوتی ہے اور جہاں سب کچھ چلتا ہے۔ لیکن وہاں بھی جینے کے لئے، ایک ایک پل جینے کے لئے ضروری اور غیر ضروری خوشیوں میں حصّہ دار بننے کے لئے انسان کو اپنی انفرادی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ پاؤش کے مطابق جینے کے لئے یہ سب ضروری نہیں ہے۔ لیکن وہ انہیں ضروری سمجھتی ہے۔ اور قدرت کی طرف سے جو کچھ ملا ہے وہ ان کا بھرپور استعمال کرتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سرمایہ اس کا مقناطیسی حسین جسم ہے۔ وہ ان خیالوں سے لڑتی ہے جو اس میں احساس کمتری پیدا کرتے ہیں۔ شاید وہ جانتی ہے اس حقیقت کو کہ جس دن اس کے اندر احساس کمتری کے عناصر پیدا ہوئے وہ اس کا لہو چاٹ چاٹ کر اسے کھوکھلا کر دیں گے، اور اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ آزاد ذہن سے سوچتی ہے اور خود میں اعتماد بحال کرتی ہے۔ وہ جینا چاہتی ہے ہمیشہ خوبصورت رہ کر اور وہ پوری دنیا کو جوان دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ کبھی بوڑھی ہونا نہیں چاہتی۔ اس احساس کی تکمیل کی خاطر وہ ہر کسی سے فراخ دلی سے ملتی ہے۔ ہنستی ہے بولتی ہے اور خوش

ہوتی ہے۔ لیکن ایسے میں بھی وہ اپنا ایک الگ معیارِ حسن رکھتی ہے۔ اس نے مختلف مردوں پر تحقیق کر کے اپنی ایک رائے قائم کر رکھی ہے اور اس کی بنیاد پر ایک فہرست مرتب کر رکھی ہے اس فہرست میں جس مرد کا داخلہ ہوتا ہے اسے ہی وہ اپنا اثاثہ سمجھتی ہے اور وہ دنیا کی دوسری سبھی عورتوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتی ہے بلڈی کیچ برڈس.....

پادش اس کا ہم سفر مرد تھا۔ مگر اسے حیرت تھی کہ وہ اس کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر میوزک فلور پر کسی دوسرے کی بانہوں میں ہوتی تھی۔ پادش کے بہت کم ملنے جلنے والے تھے۔ وہ ان کے یہاں بھی کبھی رات کے کھانے پر جایا کرتا تھا اور کھانے میں ٹومیٹو سوپ اور فرائڈ فش کی فرمائش کیا کرتا تھا۔ وہ گھر میں ہوتا تو مائکرو بائلوجی اور عیسائی مذہب کی کتابیں پڑھتا، چیس کھیلتا اور کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر کولتار کی سڑک کو تکا کرتا۔ وہ گھر میں بھی جنس اور سلیولیس ٹی شرٹ پہنے ہوئے رہتا اور اس کی ننگی بالوں بھری بانہیں اسے بڑی اچھی لگتی تھیں۔ مردوں کے ہاتھوں میں گھنے بال ویسے بھی اچھے لگتے ہیں۔ اسے یاد ہے کہ شادی کے بعد اس نے اس کی آزاد خیالی پر صرف ایک بار احتجاج کیا تھا اور بھری پارٹی میں اس کی تضحیک کر بیٹھتا۔ وہ بھی بپھر پڑی تھی ——— یو اسناب تم اعلیٰ سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہو۔ تب سے وہ کچھ نہیں کہتا۔

وہ ان مردوں سے جن میں کچھ خاص بات ہوتی ہے، دوستی کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہر بار الگ الگ پرکشش لوگوں کے ساتھ خود کو دکھنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی بے پناہ خوبصورتی کے ساتھ کوئی تضاد نہیں چاہتی بلکہ اپنی بے پناہ خوبصورتی کی طرح بخوشی قبول کرلی جانے والی شئے کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ وہ اپنے یہاں نت نئے لوگوں کو مدعو کرتی ہے اور اپنے کپڑے اور کمرے کی نمائشی چیزیں دکھا کر داد وصول کرتی ہے۔ اسے اپنے دوستوں سے بہت سارے قیمتی اور نایاب تحفے ملے ہیں۔ وہ ان کی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے اور اس کا اظہار وہ اپنے بے تکلف دوستوں کو بوسہ لے کر کرتی ہے۔ پادش اس لمحہ ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے ——— اٹس میٹر آف پلیزر، وہ کہتا ہے اور انہیں چائے کا کپ تیار کر کے دیتا ہے اور ان کی کسی فرمائش کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے۔ مگر جلد ہی اس کی الٹرا ماڈ باتوں سے اوب بھی جاتا ہے اور کھڑکی کے پاس جا کر کولتار کی سڑک دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہے اور اس کے شانوں پر بوسہ لیتا ہے ایک چھوٹی سی ملاقات کے بعد ایک دن وہ آیا تھا۔

اس کے آنے پر بھی پادش نے ہی اس کو انٹرٹین کیا تھا اور کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ جہاں وہ اپنے حریف کی عنائیتوں سے حیرت زدہ تھا وہیں پادش اس کی دلیرانہ ایپل پرسنالٹی سے مرعوب دکھ رہا تھا غضب کی باڈی لینگوئج

تھی اس کے پاس۔ اپنی اس کھوج پر اس کی گردن اکڑی جا رہی تھی۔ اس کے چوڑے شانے بادشں کے شانوں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھے اور وہ مسکراتا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی شرارت چمک ابھر آتی تھی۔

وہ بادشں کی غیر موجودگی میں آتا اور بغیر ناک کئے اس کے بیڈ روم میں داخل ہو جاتا۔ اس کے لئے تو سب معاف تھا۔ "ہائے سویٹ ہارٹ" وہ مسکرا پڑتا۔ اسے بھی اس کی کمر کی کٹاؤ بے حد پسند ہے۔ وہ جھکتا اور اپنے ہونٹ وہاں رکھ دیتا۔ پھر اسے آگاہ کراتا کہ اس کے جسم کا کون سا حصہ کتنا خوبصورت ہے۔ اسے اپنے جسم کی خوبصورتی کا شعوری طور پر اعتراف ہے لیکن وہ جب اس کے منہ سے اپنے جسم کے ایک ایک عضو چہرہ، شانے، پستان، کمر، کولہے اور پنڈلیوں کے بارے میں سنتی تو محسوس کرتی جیسے کسی اجنبی جہان کی سیر کر رہی ہو وہ اس کے سینے پر ہولے ہولے ہتھیلی مارتے ہوئے اس کی باہوں سے سٹ جاتی ــــــ "تم بے ایمان ہو۔" وہ زور زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا تو اس کے اندر جوار بھاٹے جیسی کیفیت پیدا ہو جاتی اور جنون کی شدت میں وہ اس کا ہاتھ کھینچ لیتی۔

انسان کے اندر اس کے من میں اس کا اپنا ایک گھر' ایک نجی دائرہ ہوتا ہے۔ جیسے وہ اپنا کہتا ہے اور جس پر صرف اپنا ہی اختیار محسوس کرتا ہے۔ اور جس کے تحت یہ میرا اپنا ہے' وہ میرا اپنا ہے کے احساس سے باہر نہیں نکل پاتا۔ لیکن بادشں میں وہ خاص بات کیوں نہیں ہے۔ وہ حسین ہے' اس کی باہوں کی مچھلیاں بھی مضبوط ہیں۔ پھر وہ چھوتا ہے تو اسے اپنی ہتک کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اس کی رگوں کے اندر کے پارے کیوں نہیں تھرتھرا اٹھتے۔ جن لمحوں کو وہ پوری طرح جینا چاہتی ہے' محسوس کرنا چاہتی ہے' بادشں کا جسم ان عظیم لمحوں کو سرد کیوں کر دیتا ہے۔ کوئی فاصلہ ہے جس کی بنا پر بادشں اس کا آئیڈیل نہیں ہو سکتا۔ اور تب اس نے اپنے اور بادشں کے بیچ کے لمحے سمیٹ دیئے۔ جب کبھی بادشں کی پلکیں بوجھل ہونے لگتیں وہ عاجزی سے کہتی ـــــــ "پلیز بادشں، میں ان دنوں کپڑے سے ہوں۔ یا پھر، مجھے زکام ہے۔" بادشں اسے حیا در سے ڈھک دیتا اور سمجھدار بچے کی طرح صوفے پر سو جاتا۔

اس دن "وہ" نیلی دھاری دار قمیض اور ڈھیلی پتلون میں آیا تھا۔ اس نے بالوں کو پریس کر کے پیچھے کی طرف سنوار رکھا تھا جس سے اس کا اٹیلین لُک ایکسپوز ہو رہا تھا اور چہرے پر ایک قسم کی لیکوڈ کی چکنی پرت تھی جس سے لڑکیوں سا گلیمر پھوٹ رہا تھا۔ آج وہ بے حد اسمارٹ دکھ رہا تھا۔

"ہائے سویٹ ہارٹ" وہ کھڑا بدستور مسکرا رہا تھا اور وہ اپنی گردن میں پھر اکڑن محسوس کر رہی تھی۔۔۔۔۔ نگاہیں جھکا کر اس کی قمیض کے بٹن سے کھیلنے لگی۔ کتنے دنوں بعد آیا تھا وہ۔۔۔۔۔ شاید عرصہ بعد۔ وہ اس کے

لئے بلیک کوفی تیار کر کے لے آئی۔ اسے پسند تھی۔ لیکن وہ جانتی ہے اس کے مزاج کی ندرت کو وہ آدھی کوفی سپ کرے گا اور میز پر رکھ دیگا۔ پھر جیسے ایکدم سے اس میں بے قراری پیدا ہو جائے گی۔ اس کے ہونٹ انگار کی طرح تپنے لگیں گے اور وہ انہیں جہاں رکھے گا بنلی مہر ثبت ہو جائے گی۔

اسے اپنی پشت پر جلن محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ داغ دے رہے تھے۔ وہ تڑپ گئی اور وہ اس میں سمٹ گئی۔ وہ ایک تجربہ کار مانجھی کی طرح بھنور کے گرد پتوار ڈالنے لگا اس کی اس بے رحمی پر اپنے اندر سے اٹھنے والی چھٹپٹاہٹ کو اس نے سختی سے روکا۔ پھر دھیرے دھیرے خود کو بچھاتی چلی گئی۔ اس نے اسے پوری طرح ڈھک لیا۔ لہریں چڑھائی کی طرح اٹھنے لگیں۔ اور ایک دھندلکے میں اس کا وجود گم ہونے لگا اس کی سماعت میں زور زور سے گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ وہ پوری طرح اس کے اندر تک سما جانے کی سعیٔ میں لگا تھا اور اسے پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش میں اس نے پہلا دروازہ بند کیا۔ اس کی آنکھوں میں چراغوں کے جھرمٹ کوندے وہ احتیاط سے ایک ایک دروازہ بند کرنے لگی اور قریب تھا کہ منزل اسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ دفعتاً اس کی روح میں کرچیاں بھر گئیں۔ —— "نہیں نہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ آخری دروازہ بند کر پاتی، پرستش کے اس بہت ہی نجی لمحے میں کسی تیسرے کی موجودگی کی بو پھیلنے لگی تھی۔ "وہ" بہت پھرتی سے چادر کھینچ کر اپنا منہ چھپا چکا تھا اور وہ برہنگی کا لباس اوڑھے بادشہ کے سامنے کھڑی تھی۔ کچھ لمحے کے گذر جانے تک بادشہ اس کے برف کی طرح گلے جسم کو دیکھتا رہا پھر بڑی انکساری سے نگاہیں جھکا کر بولا۔

"دروازہ تو بند کر لیا ہوتا ——"

وہ آخری قطرہ بہہ رہی تھی۔

●●

چشمے کا مدرسہ

انیس رفیع

Sh. Anis Rafi

Assistant Station Director
Calcutta Door Darshan,
Golf green Calcutta

جناب ع۔ رشید کی ایک اسکرپٹ تھی فیچر کی۔ ریڈیو نے ان کو رائٹر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے مدعو کیا تھا۔ اسٹوڈیو میں اسی فیچر کی ریکارڈنگ تھی۔ ع۔ رشید صاحب پولس میں ہیں ان کو Risk لینے کی لت بھی ہے۔ لہٰذا انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں بھی ان کے فیچر کے کچھ حصے پڑھوں۔ پولس رسک لیتی ہے تو حادثہ یقینی ہے۔ حادثہ ہو ہی گیا۔ یعنی سب سے پہلے میں نے مصنف کا نام ہی غلط پڑھا۔ ع۔ رشید کی بجائے غ۔ رشید۔ مصنف دل گردے والا ہو تو ع۔ غ کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ چیں بہ جبیں نہیں ہوئے۔ میں غین یعنی غلطیوں کے ساتھ Fast Forward اور Rewind ہوتا رہا۔ میں خود نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ ع۔ رشید کی تحریر Jump کر رہی ہے یا میری آنکھیں۔ ع۔ رشید پٹھان بھی ہیں۔ غصہ آیا اور میرا رول فیچر سے Cut کر دیا۔ پھر میں چشم زدن میں Pack off تھا۔

منہ کی کھائی تو آنکھوں کی سوجھی۔ آج ان آنکھوں کو ہو اکیا۔ بہت غور کیا کہ یہ مقام ہی غور کرنے کا تھا۔ فیچر سے اپنا رول جو کٹ گیا تھا۔ کافی غور و خوض، دوستوں، بہی خواہوں، رشتہ داروں سے کانفرنس کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ میں چالیس کے لپیٹے سے نکل بھاگا ہوں۔ نہ بھی بھاگتا تو بھی چالیس پار کرنا ہی پڑتا۔ اور آپ جانتے ہیں یہی وہ Cut Off period ہے جہاں سے چشم و شکر کی شکایتوں کا دروازہ وا ہوتا ہے۔ جانچ ضروری ہے۔ وہ کروائی۔ شکر سے تو بچ گیا مگر پڑھنے والی آنکھ راہ بے وفائی پر قدم تال کر رہی تھی۔ یہ تھی وجہ ع کے غین ہو جانے کی۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخے میں پرتھوی بنائی۔ ارض البلد اور طول البلد کی لکیریں کھینچیں۔ Axis قائم کیا۔ اور پھر مجھے یوں سمجھانے لگے جیسے جغرافیہ پڑھا رہے ہوں۔ جغرافیہ میرے لئے ایک ایسا مضمون ہے کہ دنیا گول ہے

کی حد تک بھی اسے نہیں سمجھ پایا۔ ڈاکٹر صاحب کا نسخہ اس طرح سمجھا جس طرح مولوی صاحب کی چھڑی کے ڈر سے مدرسے میں دینیات کے سبق سمجھ لیا کرتا تھا۔ میری اس ادا کو دیکھ کر میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب بے حد مطمئن ہوگئے۔ بالکل ایسے مطمئن جیسے انہوں نے عقل کے اندھے کو سمجھا کر ایک بڑی بازی مار لی ہے۔

اب مرحلہ تھا چشمہ بنوانے کا۔ مشورے ہونے لگے۔ چونکہ اگلی اور بندوق گلی کو جوڑنے والی ایک پر پیچ گلی ہے۔ حقے کے پیچوان سے بھی زیادہ پر پیچ شیشہ گلی۔ کسی نے کہا میاں انیس ادب کی گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے ہو، کبھی شیشہ گلی کی گردیاں نہیں پھانکی۔ مشہور شاعر حضرت طفل ہوشیار پوری کو چشم سازی میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ شیشہ گلی میں ان کی دکان ہے۔ پر وہاں جانے سے قبل اجالے اپنی آنکھوں کے گھر میں رکھ جانا۔ میں نے کہا کیوں۔ کیونکہ حضرت طفل گانٹھ کے پورے دل کو چشمہ مفت دیتے ہیں۔ یہ بھی خوب رہی۔ مفت خوری کی عادت ہوتی تو کتنے کئی ہوٹل فیل ہو جاتے۔ اس نے کہا میاں انیس رفیع منصور کھاؤ۔ الجدید، پنجاب، اور حمیدیہ ہوٹل کوئی میری وجہ سے بند نہیں ہوئے۔ تمہاری منڈلیاں گردشوں کے سلسلے بن کر ہوٹلوں کے رشتوں پر P. H. D. نہیں کرتی۔ اس نے کہا کمال ہے۔ آپ کو یہ بھی خبر نہیں کہ فیروز عابد کے P. H. D. کے مقالے کا عنوان ہی تھا "ڈھابے اور فٹ پاتھ کا ادب"۔ چھپنے کے بعد انشاء اللہ فٹ پاتھ پر ہی نظر آئے گا۔ میں نے کہا میاں انیس تمہاری کم شنی کا ماتم اب ضروری ہوگیا ہے۔ P.H.D کے بیشتر مقالوں کو فٹ پاتھ پر اور ادیب و شاعر کو ڈھابے میں دیکھ کر ہی فیروز عابد کو یہ عنوان ہاتھ لگا۔ چھوڑو اس قصے کو۔ طفل ہوشیار پوری کی مہارت پر روشنی ڈالو۔ کیا کیف ہے حضرت کے چشمہ وہ بنائیں کہ ستر کی عمر میں سترہ کی سوجھنے۔ شیشہ گلی کی کوٹھی پر صندوق جیسی دکان ہے۔ ہر رنگ، ہر ڈیزائن، ہر سائز، ہر نمبر کا چشمہ ان کے یہاں دستیاب ہے۔

کسی طرح شیشہ گردوں کی اس گلی میں پہنچا۔ حضرت طفل ہوشیار پوری بے حد انہماک کے ساتھ شیشہ ریزی میں مصروف تھے۔ خود ان کی آنکھ پر دیدے سے بھی موٹا گلاس چڑھا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس خاکسار کی کم نظری کا مداوا کریں اور ایک ایسا چشمہ تعمیر کریں جسے ایک بار پہننے کے بعد دوسرے کی ضرورت نہ پڑے۔ میں نے بار بار کئی بار چشمہ بنانے کی گذارش کی مگر وہ ان سنی کرتے رہے۔ جب میرا اصرار حد سے تجاوز کر گیا تو جھلا کر بولے میں چشمے تعمیر نہیں کرتا۔ چشمہ بنوانا ہو تو کسی فرہاد کو لے کر پہاڑ پہ چلے جاؤ۔ وہ تیشے سے پہاڑ کاٹ کر چشمہ جاری کر دے گا۔ میں پہننے والے چشمے کی بات نہیں کر رہا ہوں قبلہ۔ مجھے تو لگانے والا چشمہ چاہئے۔ وہ رک کر بولے۔

نویوں کہو کہ تمہیں عینک چاہیئے ۔ عینک ۔ مگر عزیز بزم جس کی زبان ٹھیک نہیں اس کی آنکھ کا کیا بھروسہ ۔ اپنی نیک نامی بدنامی میں بدل جائے ایسا میں ہرگز نہیں چاہتا ۔ میں آپ کو عینک دینے سے رہا ۔ آپ براہ کرم سامنے والے ابوخلل کی دکان پر جائیے ۔ وہ بہت اونچا جدید یہ ہے ۔ بزور کمپیوٹر علامتی عینک بناتا ہے ۔ اس عینک کو لگا کر ملاّ عرفی، عرف سالک لکھنوی کی مشہور زمانہ لاتصنیف "بے سر وپا" بخوبی پڑھ سکتے ہیں ۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد آپ سر کے بغیر سوچ سکتے ہیں اور پیر کے بغیر چل سکتے ہیں) ۔ اگر آپ یہ دونوں کام کرنا چاہتے ہوں تو یہ کتاب حضرت سالک لکھنوی کے شیلف سے چرا کر پڑھ سکتے ہیں) کہ چرا کر پڑھنے میں ہی اس کی تاثیر ہے ۔

" قبلہ آپ تو ناحق ناراض ہو گئے ۔ سارا عالم عینک کو چشمہ کہہ رہا ہے ۔"

" ویسے ہی جیسے نکاح کو شادی اور عشق کو محبت ۔"

"آپ کا فنِ عینک سازی میں بڑا شہرہ ہے ۔ اسی ناتے آگیا تھا ۔ ورنہ اب کون پوچھتا ہے چشمے کو ۔ فرنگیوں نے تو وہ چشمے ایجاد کئے ہیں جسے آپ کی یہ عینک بھی نہ دیکھ سکے ۔"

"جائیے ان ہی کی دکان میں ۔ پھر یہ شعر پڑھتے ہوئے لوٹیں گے ؂

ع ۔ کیسا شیشہ چڑھالیا پیارے — کوئی صورت نظر نہیں آتی

" واللہ جواب نہیں آپ کے اس شعر کا ۔ دراصل اس دن آپ نے گھاس پٹی کے مشاعرے میں بڑے بڑے پیر دتی شعراء کے چشمے اڑا دیئے تھے ۔"

" کیا آپ اس مشاعرے میں موجود تھے ؟ پہلے کہا ہوتا تو آپ کو کیسی عینک چاہیئے ۔ جرمن ، ہالینڈ بلجیم ہر ملک کی عینک بناتا ہوں ۔"

" گویا آپ میرا چشمہ بنائیں گے "

" بالکل مفت "

" کہاں آپ مجھے ابوخلل کی دکان پر بھیج رہے تھے اور کہاں اب بالکل مفت "

" آپ نے گھاس پٹی والا مشاعرہ جو سنا تھا ۔"

" یاد نہ دلائیے اس مشاعرے کی ۔ آپ کا ہر شعر Royal کی جانب کا مزہ دے رہا تھا ۔"

" میں آپ کی شعر فہمی کا قایل ہو گیا ۔"

" آپ اتنے اچھے کاریگر ہیں چشمے کا کارخانہ کیوں نہیں کھول لیتے "

" اگر میں کارخانہ کھول لوں اور ڈاکٹروں سے سانٹھ گانٹھ ہو جائے تو سارا شہر اندھا ہو جائے گا ۔"

"میں خالصتاً شاعر ہوں بعد کو عینک ساز"

"تو شعر ڈھالنے کا کارخانہ کھول لیجئے۔ بینک سے Loan دلوا دوں گا"

"ہمارے ہندوستان میں اشعار ڈھل ہی تو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاعری کی اس کارخانے (Industry) کو Nationalised کر لینا چاہیئے تاکہ مزدوروں کو اچھی اجرت مل سکے۔ اردو کے جرائد و رسائل جو استحصال کر رہے ہیں اس کا خاتمہ ہو سکے۔"

"آپ نے بجا فرمایا۔ کب ملے گا چشمہ"

"آج چھوڑ کل"

"تو پھر کل حاضر ہوتا ہوں"

آخرش ہوگئی عینک تیار۔ دفتر پہنچا۔ عینک بردار ناک۔ چپراسی سے لے کر افسر تک گھورتے رہے میرے چشمے کو۔ اسی شام ایک فنکشن میں گیا۔ وہاں عینک اتاری اور شیشے کے بل رکھ دیا۔ صدر جلسہ نے بڑے نزاکت سے فرمایا "کیا آپ نے چشمہ نیا نیا لیا ہے"۔ میں نے کہا "جی ہاں آج ہی" "تو یہ جان لیجئے کہ آج کل عینک ہمیشہ الٹے رکھے جاتے ہیں۔ یعنی فریم کے بل۔ شیشے کے رخ نہیں ورنہ چشمہ آپ بھولیں گے بہت۔ اچھا تو یہ ہے کہ تعویذ کی طرح لٹکانے کا بندوبست کر لیجئے۔ بازار میں چشمہ باندھنے کی زنجیریں ملتی ہیں۔ تو کیا آج کل چشمے بھی زنجیروں سے باندھے جاتے ہیں۔ ملک آزاد ہوا ہے تو وہاں کی چیزیں زنجیروں میں قید کر دی جاتی ہیں۔ کہیں کوئی شے آزاد نہیں، سب پر کوئی نہ کوئی قبضہ۔ سب کے پیروں میں کوئی نہ کوئی زنجیر۔ آپ اپنا پاؤں دیکھیے زنجیر سے بندھا ہے کہ نہیں... مجھے احساس ہوا میرے پاؤں میں زنجیر (گھنگرو) اور دل نہیں رہا۔ پھر انہوں نے پوچھا، اچھا یہ بتایئے پاور کیا ہے۔ میں نے کہا بیوقوف ہی Power less رہا۔ لہٰذا چشمے کا کیا پاور ہو سکتا ہے۔

میرے کہنے کا مطلب ہے کہ پلس ہے کہ مائنس"۔ مائنس پلس کا چکر بہت خراب ہوتا ہے، ویسے پلس تو ہونے سے رہا مائنس ہی ہوگا"۔ "دیکھنے سے تو Plus ہی لگ رہا ہے۔

کہاں سے بنوایا" "جی طفل ہشیار پوری سے"

"ارے قبلہ آپ مجھ سے کہتے میں بنوا دیتا۔ ہشیار پور جانے کی کیا ضرورت تھی" •

"دراصل طفل ہشیار پوری شاعر ہیں اور عینک ساز بھی"

"مگر میں نے سنا ہے کہ جب وہ Minus بناتے ہیں تو Plus دکھائی پڑتا ہے اور جب پلس بناتے ہیں تو مائنس۔ انگریزوں نے بہت ساری دکانیں چھوڑی ہیں۔ آپ وہاں جا سکتے تھے۔ اب

دیکھئے آپ کی خوبصورت آنکھوں کا کیا بنتا ہے۔

مطلب؟ مطلب یہ کہ پاور کا چکر ہے۔ آپ Power Game کو نہیں سمجھتے!!

یہ تو بہت برا ہوا۔ میں تو ہمیشہ اس کھیل سے دور دور رہا۔ مگر اب اس چکر میں آگیا۔ کیا کیا جائے عمر کا تقاضہ ہے۔

میرے ایک ماما ہیں جنہیں ہم پیار سے ماما تفصیلی کہتے ہیں۔ وہ آج کی بات برسوں سے اور کل کی بات پشتوں سے شروع کرتے ہیں۔ جب چشمہ لگا کر ان کے گھر پہنچا تو انہیں ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے ایک ساتھ کئی تجربہ کار نظروں سے مجھے اور میرے چشموں کو دیکھا۔ پھر گویا ہوئے۔

تمہیں اب پتہ چلا کہ دو سال پہلے ہی تمہارا چالیسواں سال گذر گیا۔ میرے نانا جان آخری حکیم تھے۔ جسے انگریزی میں Epoch Making حکیم کہا جاتا ہے۔ بڑی بیرالسٹر سے پہلے ہی میرے چشمے کا نمبر تجویز فرمایا تھا اور ٹھیک چالیسویں برس میں نے وہ تجویز شدہ ۵۸ نمبر لگایا ہے۔ لگاتے ہی جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ نانا ابو کے کرامات سے زانو پر اردو کی نئی لغت اور پونٹی باندھی۔ اگر نانا مرحوم زندہ ہوتے تو میری وسیع النظری کی داد دینے کو۔ آج وہ زندہ ہوتے تو مجھے اپنا دیکھ رہا ہوتا۔

میاں یہ بتاؤ کہ یہ چشمہ اب تجویز کروایا تھا جب کہ ہی کئی برس پہلے وہ نمبر تھا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بالکل نئی چیز۔ اور تم نے چشمہ بھی بنا لیا۔ بہت برا کیا۔ میاں تجویز شدہ نمبر کے گھی اور انگریزی شراب کی طرح جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی اثر دار ہوتی ہے۔ تم نے زمانہ کو پیمانہ بنا کے سے رہے"۔ میں نے کہا ماما اب زمانہ کا پیمانہ کہاں بنتا ہے۔ یہ سب تو پرانی باتیں ہیں۔

تم لوگوں نے تو ساری پرانی باتیں ختم کر دی ہیں۔ اب تو خطوں میں بیٹوں کے لیے لفظ ڈیر لکھا جاتا ہے نور چشمی والے دن تو واقعی ہوا ہو گئے۔ کم از کم نور چشمی لکھنے سے لوگوں کو بچپن میں ہی چشمے کا احساس ہو جاتا تھا۔ خیر چھوڑو ان پرانی باتوں کو۔ میں میخ نکالنے سے کیا حاصل۔ جب چشمہ لے ہی لیا ہے تو اس کے رکھ رکھاؤ اور Status سے بھی واقف ہو جاؤ۔"

"کیا چشمے کا بھی رکھ رکھاؤ اور Status ہوتا ہے"۔

صرف یہی نہیں تہذیب بھی ہوتی ہے چشمے کی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ماما تفصیلی کے رو برو کوئی رنگین چشمہ پہن کر جا نہ سکے۔ ان کا خیال تھا کہ رنگین چشمہ پہننے والے کی نہ صرف دور بینی گھٹ جاتی ہے بلکہ وہ آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا

لہٰذا تم جب بھی چشمہ بنوانے کا قصد کرو تو سب سے پہلے خاندان در خاندان کے سارے افراد کی ایک کانفرنس بلواؤ۔ پھر خود سب کی رائے فرداً فرداً لو کہ کیسا شیشہ، کیسا فریم مناسب ہے تاکہ چشمہ لگا کر جب تم ان لوگوں کے درمیان آؤ تو کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ چشمے میں پاور زیادہ ہو تو کم بتاؤ اور کم ہو تو زیادہ۔ نانا حضور کا کہنا تھا کہ اپنی نظروں کی پہنچ یعنی Range کو ہمیشہ راز میں رکھو۔ ایک زمانہ ایسا تھا جب اندھے خود کو آنکھ والا اور آنکھ والے خود کو اندھا بتاتے تھے۔ راز داری کی انتہا یہ تھی کہ مرتے دم تک یہ پتہ نہ چلتا کہ مرنے والا اندھا تھا یا آنکھ والا۔ اسی لئے ان دنوں سراغ رسانی کا کام جوکھم بھرا تھا۔ اب تو آپ سراغرسانی کا ایک دفتر کھول لیجئے۔ شہر کے سارے راز سیلاب کی مانند بہہ کر خود ہی آپ کے دفتر میں چلے آئیں گے۔ آج کل لڑکے لڑکیاں عشق کا آغاز کرنے سے قبل ایک دوسرے کے محلوں کے سراغ رساں دفتروں سے Clearance ضرور لیتے ہیں۔ ایک سراغ رسانی دفتر سے بیوی اپنے شوہر کے کرتوت کی جانکاری لینی چاہی تو دفتر والوں نے خود اس کے کرتوت کی کاربن کاپی اسے تھما دی۔ بیوی نے غصّے سے کہا یہ کیا۔ جواب ملا آپ کے شوہر نامدار آپ کی Report Original لے گئے۔ تو ٹھیک ہے اب آپ ان کے کالے کرتوت کی تفصیل درج کر لیجئے اور جب ان کی ایک کلب والی گرل فرینڈ آئے تو یہ رپورٹ اسے دے دینا اور ہاں یہ لو تنّو کا نوٹ۔ یہ ہے رپورٹ دینے کی فیس۔

چشمے کی تہذیب اور Status کا حال سن کر میں ہکّا بکّا رہ گیا۔

میں Status Syndrom سے باہر بھی نہ آیا تھا کہ ماما تفصیلی مزید تفصیل بیان کرنے لگے۔

میرا ایک دوست اپنے چشمے کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا کہ وہ کس ملک کے سفر پر جا رہا ہے یا کس ملک سے آ رہا ہے۔ اس راز کو میں تو کم مگر ایئرپورٹ کے بھکاری زیادہ سمجھتے تھے۔ ایک بار میں اسے دمدم ایئرپورٹ پر Recieve کرنے گیا۔ وہ گولڈن فریم کا زاویہ قائمہ لگائے ہوا تھا۔ جب میں اسے کار کی طرف لے جا رہا تھا تو ایک بچی بھکارن اس کے پیچھے لگ گئی۔ کچھ دیجئے نا بابو۔ کچھ دیجئے نا۔ میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے ایک چونّی جیب سے نکالی اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس نے چونّی واپس میری عینک پر ماری اور ناراض ہو کر بولی "تم سے کس نے مانگا۔ میں تو لندن والے صاحب سے مانگ رہی ہوں۔ ایک پاؤنڈ دیدو صاحب، پاؤنڈ چاہیئے صاحب"۔ میں اس کے پاؤنڈ مانگنے پر گھبرا گیا۔ بھیک میں پاؤنڈ مانگا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی چونّی کے Status پر رونا آ رہا تھا۔ میرے دوست نے لندن کے کئی Coins اسے دیئے تب جا کر جان چھوٹی۔ میری داہنی طرف دوست کی باجی بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ وہ

بھی لندن سے بی آرہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ جب بھی میں اپنے سسرال آتی ہوں۔ ہر جمعرات اور جمعہ کو فقیر ضرور کھلاتی ہوں۔ لہٰذا پچھلی بار بھی میں نے اپنی سسرال میں ایک فقیر کو دعوت دی کہ وہ کل کھانے پر آجائے۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا۔ دعوت قبول کرنے سے پہلے آپ مجھے یہ بتائیے کہ کل کا Menu کیا ہے۔ محترمہ مجھے فقیر نہ سمجھئے Begger ہوں Begger
کیا آپ کو اپنے چشمے سے میرا چشمہ نظر نہیں آتا "
ماما تفصیلی سے Status کے یہ قصے سن کر مجھے خیال آیا کہ طفل ہشیار پوری کے ہاتھوں بنی یہ غریب و ناتواں عینک زیادہ کچھ دیکھے گی تو چھنک کر ٹوٹ جائے گی۔
پھر میں نے اسے آنکھوں سے جدا کیا اور خول میں بند کر دیا۔

عین۔ رشید

کی ۵ نظمیں

عین رشید — ایک نظر میں

نام : عین رشید خان

قلمی نام : عین رشید

والد کا نام : عبدالرحمان خان

تعلیم : بی۔ اے (آنرز)

موجودہ منصب : ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل آف پولیس مغربی بنگال

پتہ : فلیٹ نمبر ۴۷، 28/1A، گریا ہاٹ روڈ، کلکتہ-۷۰۰۰۲۹

تصنیف و تراجم :
- ہم عصر ہندستانی اردو شعرا کے کلام کا ترجمہ بنام Contemporary Indian poetry ہینی مین Henni man لندن نے شائع کیا۔
- مشہور بنگلہ شاعر شکتی چٹو پادھیائے کے اشتراک سے بعنوان "غالیبر کوبیتا" غالب کے اشعار کا بنگلہ ترجمہ جس کی اشاعت "وشو بانی" کلکتہ نے کی۔
- بنگلہ کے پانچ بڑے شعرا شبھاش مکھو پادھیائے، شکتی چٹو پادھیائے، سنیل گنگولی، امیتا بھ داس اور شمشیر الانور نے عین رشید کی نظموں کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بنگلہ زبان میں "البوشی بھاؤنا" کے نام سے چھپی ہے۔

فلم :
- استاد امیر اللہ خاں کی پانچویں برسی کے موقع پر دوردرشن کی جانب سے بنائی گئی فلم جس کی ہدایت اور اسکرپٹ عین رشید کے ہیں۔ یہ فلم فروری ۱۹۷۹ میں دوردرشن کے تمام مراکز سے دکھائی گئی۔
- حکومت مغربی بنگال کے شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور کے زیر اہتمام کلکتہ کے مسلمانوں پر ساتواں آدمی (A seventh man) نامی فلم بنائی جس کی نمائش لیپ زک فیسٹول، انڈین پینوراما — ۸۲، فیسٹول سنیما Du reel پیرس، لندن فیسٹول، ٹمپرا فیسٹول ڈنمارک میں ہوئی۔
- گوتم گھوش کی ہدایت میں بنی فلم "پتنگ" کا اسکرپٹ اور مکالمے لکھے۔
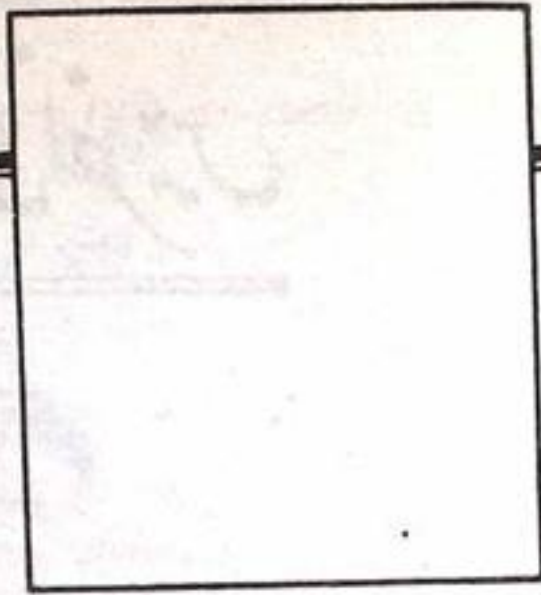
عین رشید

Flat 47, 28/1A, Gariahat Road
Calcutta - 700 029 (West Bengal)

Sh. N. Rasheed

کھلے ہیں پھول پھر
ہر بادِ وفا کو دعوتِ آوارگی پھر ہے
نرم نیلے پروں کو پھڑپھڑانے کی اجازت
دیر تک ہے
اب
ذرا کچھ دور ہے
پلکوں سا نیلا
خوبصورت گاؤں

عین رشید

قسطوں میں خواب

میں جب چھوٹا تھا
تو چلتے چلتے خواب دیکھا کرتا تھا
اکثر میں صرف خواب دیکھنے کے لئے ہی چلتا تھا
صبح کو، دوپہر کو، شام کو
رات کو گہری نیند سوتا تھا
جو گہری نیند سوتے ہیں وہ خواب نہیں دیکھتے
سارے خوابوں کا مرکزی کردار میں ہی ہوا کرتا تھا
مگر میرے قریبی اور پیارے لوگ بھی اس میں شامل رہتے تھے

میرے خواب طویل اور منظوم ہوتے تھے
اور میں اکثر ان میں ترمیم کیا کرتا تھا
کچھ خواب (جو دل کو نہ بھاتے تھے)
انہیں چھوڑ کر نئے خواب کی شروعات کرتا تھا

اب میں رات بھر
صبح کو بھی
اور خاص کر صبح کو
قسطوں میں خواب دیکھتا ہوں
ادھ جلے خواب
کچھ خوابوں سے نجات ملتی ہے
تو جی خوش ہو جاتا ہے
سارے خواب جانے پہچانے ہوتے ہیں
مانوس خواب
تفصیلی خواب
کچھ خواب روزمرّہ تفصیلوں سے بھی واضح
کچھ سہانے خواب جو رک جاتے ہیں
تو انہیں دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں
خواب خود کو کبھی نہیں دہراتے

ان دیکھے خواب
اب خوابوں کی دنیا میں ہیں۔

عین رشید

ہم وہاں دیر سے پہنچے

ہم وہاں دیر سے پہنچے
مگر ہم سے کسی نے نہیں پوچھا
عقلمند لوگ تھے
ورنہ ایسی بات ہوتی کہ
کوئی کولمبس سے پوچھے کہ وہ دو گھنٹے دیر سے کیوں آیا
وہ دن اس کا آخری دن تھا
اور ہمارے سفر کا پہلا
نیند اور سفر سے ماؤف
ہمارے جسموں میں
غسلوں کے خواب تھے
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر
تم عزیز ہو؟
یا تمہارے ماتھے پر چمکتا تابدار ستارہ
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر ہمیں ایک ندی نظر آئی
جو ہماری گاڑی کی طرح
بے دلی سے سمندر کی طرف جا رہی تھی
ہماری گاڑی کی بے دلی گھنٹوں میں
غصّے میں تبدیل ہو گئی
پہیے گرم ہو گئے اور رک گئے
ہم نے کیلوں کے پتّوں کے ابھار سے
پہیوں کے غیض و غضب سے نجات پائی
ہماری گاڑی اور ندی بے دلی سے
سمندر کی طرف چلتی رہیں
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر ہمیں مضبوط جڑوں والے قدیم لوگ نظر آئے
جن کے اجداد نے پتھر کاٹ کر مندریں بنائی تھیں
لوگ جو کوٹ نہیں پہنتے اور گوشت نہیں کھاتے
ہم نے وہاں پنکھے چلائے اور سبزیاں کھائیں
رات کے ہم سفر، شام کے ہمسفر

پھر آثارِ قدیمہ کے ایک کھنڈر میں
مجھے ایک لڑکی نظر آئی
جو تاریخ کے اوراق سے نکل کر آئی تھی
جی میں آیا جا کر دیکھوں کہیں
اس کے بال سفید تو نہیں ہو گئے
مگر ہمارے ساتھ کتنے لوگ تھے
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر
ہمیں
سمندر دکھائی دیا
سب خوشی سے چہک اٹھے
چہکنے کی بات ہی تھی
سمندر کے اس پار
دنیا
اور پھر
زندگی

عین رشید

کون ہے تو؟

سایہ میرا مجھکو دیکھ کے بھاگے ہے
پھر بھی میرے ساتھ رہے ہے
کون ہے تو؟

ابھی تری قربت ہی زیست کا باعث ہے
پھر بھی تجھ سے ڈر ہی لگے ہے
کون ہے تو؟

تجھکو دیکھ کے پیار سے دل بھر آئے کبھی
دوجے لمحے جی لرجے ہے
کون ہے تو؟

تیرے من کی باتیں من کی باتیں ہیں
پھر بھی من کی بات نہ سمجھے
کون ہے تو؟

راز کی ساری باتیں تجھ سے کرلوں میں
پھر بھی جی کا حال چھپاؤں
کون ہے تو؟

شرم سے سر جھک جائے جب بھی آئے تو
پھر بھی دل کے پاس رہے ہے
کون ہے تو؟

تیری سانسوں کا موسم ہی موسم ہے
غیروں کا موسم ہی لگے ہے
کون ہے تو؟

تجھ کو دیکھ کے لب خشک ہو جائیں کبھی
باتیں کرنے کو دل ترسے ہے
کون ہے تو؟

جھک کے جب بھی دیکھوں اپنی لگتی ہے
پھر بھی مجھ سے دور رہے ہے
کون ہے تو؟

عین رشید

دن اور رات

موت کی بو
صرف شمشانوں، قبرستانوں
ہسپتالوں
لوبان یا اگربتی میں نہیں ہوتی

موت کی بو
آستینوں
اور ناف کے نیچے بھی چھپی رہتی ہے
ہمیں موت کی بھبک
اس بڑھیا کی آنکھوں میں ملی تھی
جو اپنے جوان پوتے کا انتظار
ان ہیجانی دنوں میں
بھی جو راہ پر کرتی تھی
اور ٹکٹکی ٹکٹکی ہمیں تکتی اور پوچھتی تھی
بابا وہ کب آئے گا
ہم سب اس کو دلاسہ دیتے تھے کہ

وہ جلد ہی واپس آئے گا
حالانکہ ہم جانتے تھے کہ
وہ کہیں اور ہے

گھر کے آنگن میں
اس نوجوان کی ماں
جو اپنی سانس سے
چالیس سال زیادہ اداس تھی
اس آنگن میں بھی موت کی بو تھی

ہم چپ چاپ اس نوجوان دوست کو تکتے رہے
جس کے بیکار لب اب کچھ نہ کہیں گے
نہ ہی وہ ہماری سرگوشیاں سن سکے گا

رات
پرانے دکھوں کی طرح
بے حس اور زندہ
دور
خاموشی
کسی بے چین روح کی طرح
چپ چاپ اور سہمی ہوئی

پھر ہم بے بسی اور
عجز و انکساری سے سانس لیتی
رات کو تکتے رہے
زرد پتوں اور فضا سے بنائی ہوئی رات

پھر ایک اضطرابی صبح
(جو یک بیک نازل ہوگی)
اور موت کے پس منظر میں
ہر چیز کو واضح کرے گی

بند دکانیں
ہراساں لوگ
سنسان محلے
سناٹوں
اور بے گھروں کے گھروں میں
موت کی مزید تیاری میں مشغول
موت کی سلطنت کے
جواں مرد سپاہی

موت ان کی آنکھیں لئے
صبح سے شام تک ہمارے ساتھ رہتی ہے
ایک گناہ
ایک بے وقوف جرم
یا ملامتِ ضمیر کی طرح

ڈاکٹر برون کمار چکرورتی
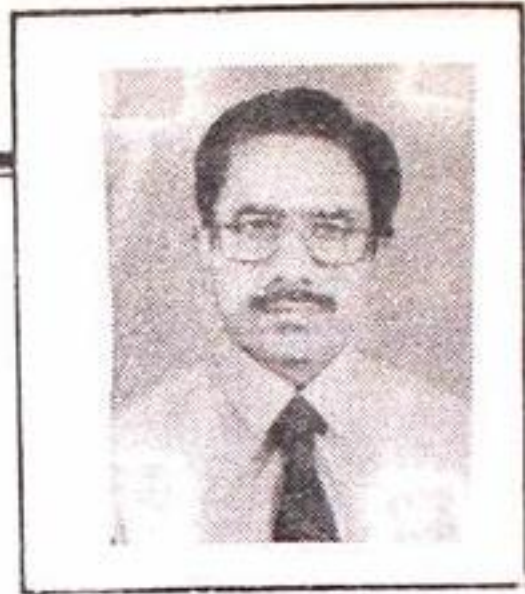
بنگلہ مقولوں میں مشہور تاریخی ہستیاں

Sh. Ahsan Shafeeq

51/17, Cowies Ghat Road
Shibpur, Howrah - 711102

ماضی میں بنگال کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی زندگی کے مختلف گوشوں سے منسلک لاتعداد تاریخی شخصیتوں میں سے چند ہی شخصیتیں بنگلہ مقولوں میں جگہ پاکر یادگار شخصیتیں بن جانے کا اعزاز پاسکی ہیں۔ بنگلہ مقولوں میں بیان کی گئیں شخصیتیں زیادہ تر بنگالی حسب و نسب سے تعلق رکھتی ہیں پھر بھی ایک دو غیر بنگالی شخصیتوں نے بھی جگہ بنائی ہے۔ جتنے تاریخی کردار ان مقولوں میں بیان ہوئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ کر اکثر کرداروں سے زیادہ اہم تاریخی کردار ہماری تاریخ میں موجود ہیں مگر جن سماجی پس منظر میں یہ مقولے تیار ہوئے ہیں یہ کردار انہیں یا تو متاثر نہیں کرسکے یا پھر اختلافی تاثر نہیں پیدا کرسکے جس کی وجہ سے انہیں ان مقولوں میں جگہ نہیں مل سکی۔ ان مقولوں میں جہاں ان شخصیتوں کی ہنرمندی کا اظہار ہوا ہے وہیں ان کے کردار کے تاریک گوشے بھی روشن ہوئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض مقولوں میں جہاں کچھ کرداروں کے تاریک گوشوں کی طرف اشارے ملتے ہیں تاریخی اعتبار سے یہ کردار تاریک پہلو نہیں رکھتے بلکہ اپنی اہمیت کے لئے مقبول ہیں۔ مزید براں یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ جن سماجی ماحول میں یہ مقولے وجود میں آئے ان کا غیر متعلق اور غیر متعصب ہونا تاریخ کی نظر سے پوشیدہ ہی رہا۔

بہرکیف تاریخی شخصیتوں پر مشتمل مقولوں کے تبصرے کے ذریعہ ہمیں ماضی کے بنگال کی تصویر اور ساتھ ہی مختلف تاریخی کرداروں کی رنگا رنگ شخصیت سے تعارف کا شرف ملے گا۔

ایک مقولہ ہے: ـــــــــــ

ঘুটে কাঠ কুড়াতে গেল।

گھونٹی کاٹھ کوڑاتے گے نو
مہیپالیر گیت پے نو

ایک دوسرے مقولے میں بھی مہیپال نے جگہ پائی ہے۔

ধান ভানতে মহীপালের গীত।

دھان بھانتے مہی پالیر گیت

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مہیپال کون ہیں جن کی تخلیق دھان کاٹتے وقت گائی جاتی تھی۔ یا دھان کوٹتے وقت جن کے گیت پائے جانے کی بات کی گئی ہے۔ ان دونوں مقولوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ مہیپال ایک ایسے مشہور آدمی تھے جنہوں نے مہذب سماج سے دور سادہ لوگوں کے دلوں میں بھی اپنی جگہ بنائی تھی وہ ان کی مشغول زندگی کے ہر موڑ پر ایک امید اور پریرنا بنکر موجود ہوئے تھے۔

بنگال کی تاریخ میں مہیپال نام کی دو شخصیتیں ملتی ہیں یہ دونوں ہی پال خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ایک مہیپال اول اور دوسرا مہیپال دوم۔ مقولے میں صرف مہیپال کا ذکر ہے مگر کون مہیپال اس کا کوئی اشارہ نہیں۔ اس لئے ہمیں دونوں مہیپال کے بارے میں جان لینا ہوگا تب ہی ہم یہ معلوم کرسکیں گے کہ مقولے میں بیان شدہ مہیپال کون ہے۔

مہیپال اول پال خاندان کے راجا بیگرہ پال دوم کے لڑکے تھے انہوں نے نصف صدی تک بادشاہت کی۔ ان کے دورِ حکومت میں پال خاندان نے جو اچھے دن دیکھے اس کا ثبوت تاریخ میں موجود ہے۔ پال خاندان کی کھوئی ہوئی عظمت کو بہت حد تک بحال کرنے میں یہ کامیاب ہوئے تھے۔ پورے اتر بنگال مشرقی بنگال و مغربی بنگال کے کچھ حصے اور بہار کے کئی ایک حصے بھی مکمل طور پر ان کے زیر اثر تھے۔ ۱۰۲۶ء تک ان کی حکومت بنارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ کمبوج نامی قبیلہ کے حملے سے انہوں نے بہت سی ریاستوں کو محفوظ رکھا تھا۔ بہت ساری جگہوں پر انہوں نے اشوک کے لاٹ نصب کرائے۔ بہارِ عظمیٰ کے اگنی دہ پر مشہور نالندہ کی تعمیر کا بندوبست، بودھ گیا میں ایک دو مندروں کی تعمیر کاشی میں درگا کا نیا مندر اور مختلف دیوی دیوتاؤں کے مندروں کی بنیادیں انہیں کی کارگزاریاں ہیں۔ دینا جپور میں قائم شدہ مہیپال دگھی مہیپال اور مہیشور ہسپتو سن جیسی جگہوں سے آج بھی ان کی یاد تازہ ہے۔ مہیپال اول نے اپنے آخری دنوں میں کلچوری راج کے گنگا دیب کے ہاتھوں شکست کھائی۔ ان کے عہد میں بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان)

میں ایک نئی سماجی بیداری کی لہر چل پڑی تھی۔

دوسری طرف مہیپال دوم بھی پال خاندان کے دوسرے راجا تھے۔ انہوں نے بھی پال خاندان کی روایت اور مقاصد کی بہت حد تک پاسداری کی۔ انہیں کے دور حکومت میں باغی لیڈر دیباکر کی پیشوائی میں رعایا کی بغاوت ہوئی تھی جس سے صاف ظاہر ہے کہ مہیپال دوم کو رعایا کی محبت حاصل نہیں تھی جبکہ مہیپال اول نے رعایا کی محبت حاصل کی تھی اور وہی مقولاتی شخصیت بنے تھے۔

ایک مقولے میں کہا گیا ہے ؎

মোয়ের শিঙ, ভেড়ার শিঙ, তারে কি বলে শিঙ
শিংয়ের মধ্যে ছিল এক গঙ্গা গোবিন্দ সিং ঃ

موشیر شینگ، بھیڑار شینگ، تارے کی بولے سینگ
شینگھیر مدھے چھیلو ایک گنگا گوبند وسینگ

یہ گنگا گوبند سینگ اصل میں گنگا گوبند سنگھ تھے ان کی پیدائش ۱۷۴۹ء میں ہوئی تھی۔ گنگا گوبند سنگھ کاندی خاندان کی سلطنت قائم کرنے کے سلسلے میں مشہور ہیں۔ یہ فارسی زبان اور شاہی حساب کتاب میں ماہر و مشہور تھے۔ وارن ہسٹنگز نے انہیں دیوان کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ راجہ دلبھ کے دربار میں مددگار دیوان تھے۔ ان کے کام سے ہسٹنگز بہت زیادہ خوش تھے اور بعدازاں انہیں ریاستی محکمے میں مکمل ذمہ داری کے ساتھ اس عہدے کو تفویض کیا تھا۔ بنگال کے مختلف علاقوں میں یہ جو کافی زمینوں کے مالک ہوئے یہ بھی ہسٹنگز کی مہربانی تھی گنگا گوبند اس وقت کے زمینداروں کے کارندے کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ زمین داروں کا چین وسکون ان کی ذات سے قائم تھا۔ رعایا پر ظلم و زیادتی کے سلسلے میں جس قدر گنگا گوبند یکتا تھے اسی طرح مذہبی معاملات اور خیر و خیرات کے سلسلے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ صرف شرادھ میں انہوں نے اس وقت تقریباً بیس لاکھ روپے خرچ کئے تھے۔ اپنے لڑکے لال بابو کی موت پر "ان پراشن" (موت پر کھانا کھلانا) میں بھی بے انتہا خرچ کیا تھا۔ خیر خیرات کی ان کی پوری رقم تقریباً نوے لاکھ روپیہ ہوگی۔ کاندی اور کلکتہ کے کئی ایک مندروں کی بنیادیں بھی گنگا گوبند نے رکھی تھیں۔ زیادہ تر برہمن پنڈت ان کے دور میں آمدنی سے مستفیض تھے۔ گنگا گوبند کا ۱۷۹۳ء میں کلکتہ کے پائک پاڑہ کے راج محل میں انتقال ہوا۔

ناٹور کے راجا رام کرشن نے ایک مقولے میں جگہ پائی ہے ؎

কোথায় রাজা রামকৃষ্ণ, কোথায় ভজা জেলে!

"کوتھائے راجا رام کرشن، کوتھائے بھسجا جیسلے"

بہت مشہور اور محترم شخصیت کے ساتھ ایک بہت ہی معمولی اور انجان شخصیت کی ہمسری کے بابت یہ مقولہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اب دیکھا جائے کہ مقولے میں جگہ بنانے کی وجہ کیا ہے۔ رام کرشن ایک بہت ہی معمولی اور مفلس گھرانے کی اولاد تھے۔ مگر قسمت نے یاوری کی اور یہ رانی بھوانی کی لے پالک اولاد بن گئے۔ اور اس طرح انہیں راج پاٹ بھی مل گیا۔ دلی کے بادشاہ عالم گیر نے رام کرشن کو مہاراجا دھیر اج پرتھوی پتی بہادر کے خطاب سے نوازا۔ انہوں نے لارڈ کارنوالس کے دس سالہ بندوبست کے خلاف مزاحمت کی تھی اگرچہ یہ مزاحمت بارآور نہیں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ راجا رام کرشن غربت سے بادشاہت تک پہنچے تھے مگر دنیاوی عیش وعشرت کے لئے انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو کمزور ثابت نہیں کیا۔ کمزور تو خیر کبھی نہیں ہوئے بلکہ آنے والے دلوں میں اور بھی عزیز شخصیت بن گئے۔ اسی وجہ سے ایک قابل احترام شخصیت کی طرح مقولے میں جگہ حاصل کرلی۔

ناٹور کی رانی بھوانی نے ایک دو مقولوں میں جگہ بنائی ہے قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ بنگلہ مقولوں میں جن تاریخی شخصیتوں نے جگہ بنائی ہے۔ ان میں عورتوں کا شمار صفر کے برابر ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک استثناء رانی بھوانی کی ہی ہے۔ اس لئے اس ضمن میں رانی بھوانی کی جو اہمیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رانی بھوانی نے ثقافتی مقولوں میں بھی بہت زیادہ مشہور اور جانی پہچانی عورتوں کے ساتھ انجانی اور بہت زیادہ معمولی دوشیزاؤں کے بیچ بھی اختلافی شخصیت کا مقام حاصل کیا ہے۔ رانی بھوانی سے متعلق تبصرہ سے پہلے دو مقولوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں مقولوں میں اشیاء کا ذکر اہم ہے۔ ایک صرف تعظیم کے مقابلے میں تھوڑی سی تذلیل در آئی ہے۔

কোথায় রাণী ভবানী,, কোথায় পাড়ার শেজ মুতনী!

کوتھائے رانی بھوانی کوتھائے پاڑار شیج موتنی

____ شیج موتنی یا گھونٹے کوڑانی

دوسرا مقولہ یہ ہے

রাণী ভবানী আর ফুল জেলেনী!

رانی بھوانی آر پھول جےلینی

رانی بھوانی کا جنم ۱۷۱۵ء میں باگوڑا کے چھاتیان گاؤں کے برندر برہمن خاندان میں ہوا۔ رانی بھوانی

کے والد آتمارام چودھری تھے۔ خوش خصلت اور خوبصورت رانی بھوانی ناٹور کے راجا رام جیون رائے کے لڑکے رام کانت رائے کے ساتھ رشتہ طے ہوا۔ رام کانت رائے کی موت کے بعد شمالی بنگال کے باگوڑہ ضلع تک کی حکمرانی رانی بھوانی کے حصے میں آئی۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۲ برس کی تھی اور وہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی مالیت کی زمین کی مالک ہوئیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد خود زمینداروں کی ریکھ دیکھ کرتی تھیں۔ برے دنوں میں زمین کی مالگذاری نہیں ادا کرسکنے کی وجہ سے وارن ہیسٹنگز نے ان کی بہت ساری دولت لوٹ لی۔ ان سب کے خلاف رانی بھوانی نے گورنر جنرل کی کونسل میں اپیل کی بعد ازاں کونسل نے ان کی تمام لوٹی ہوئی دولت اور ضبط شدہ جائیداد واپس کر دی۔

بنگال میں رانی بھوانی خاص طور سے دان پن والی مذہبی عورت کے طور پر مشہور ہے۔ کاشی، گیا، راج شاہی اور دیگر مختلف مقامات پر دیوتاؤں کے مندر تعمیر کیے۔ اس کے علاوہ دیش کے مختلف مقامات پر سرائے اور پانی کی قلت دور کرنے کے لئے تالاب اور کنویں کھدوائے تھے۔ دیوتاؤں کی دیکھ ریکھ، مہمانوں کی دیکھ بھال اور طرح طرح کے مذہبی کاموں کے لئے انہوں نے ایک لاکھ اسّی ہزار نقد رقم مخصوص کر رکھی تھی۔ بیربھوم، راج شاہی، نگوڑا، جیسور اور ڈھاکہ کی تفریحی جگہوں پر دیو مندر کی تعمیر اور برہمن و کائستھ وغیرہ کے لئے تقریباً پانچ لاکھ بیگھہ زمین دیوتر یا برہموتر کے طور پر دیئے تھے۔ چونکہ ناٹور سے گنگا نہیں گذرتی تھی اس لئے رانی زیادہ تر مرشدآباد میں گنگا کنارے بڑنگر گاؤں میں رہا کرتی تھیں۔ اناسی برس کی عمر میں انہوں نے ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا۔ اجودھیا کے نواب آصف الدولہ کے نام سے بھی ایک مقولہ ملتا ہے۔

যারে দেয়না খোদতালা, তারে দেয়না আসফ্উদ্দৌলা।

"جارے دیئے نا خدا تالا، تارے دیئے نا آصف الدولہ"

آصف الدولہ اجودھیا کے چوتھے نواب تھے۔ اپنے والد شجاع الدولہ کی موت کے بعد ۱۷۷۵ء میں اجودھیا کے تخت پر بیٹھے۔ نجی زندگی میں آصف سخی تھے۔ مقولہ میں ان کی اسی سخاوت کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی ایک اور پہچان تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ پہچان ان کے کردار پر کلنک کا ٹیکہ ہی ثابت ہوئی جو مقولوں میں جگہ نہیں پا سکی۔ انہوں نے اس وقت انگریزوں سے سازباز کر کے اپنی ماں اور ساس کی دولت، طاقت کے بل پر حاصل کر لی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ان کے فیض آباد معاہدے کی رو سے اجودھیا کی حفاظت کے لئے انگریز فوجوں کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے اجودھیا مجبور تھا۔ اس لئے اجودھیا پر بہت زیادہ قرض ہو گیا اور اس قرض کی ادائیگی کے لئے وارن ہیسٹنگز نے

اجودھیا پر بہت دباؤ دیا۔ نواب آصف الدولہ کی ماں اور ساس نے بہت دولت جمع کر رکھی تھی۔ لہٰذا آصف الدولہ نے اُسے بزور حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کے ساتھ سازش کی۔ اگرچہ انگریز اجودھیا کی بیگموں کی حفاظت کے لئے معاہدے کی رو سے پابند تھے مگر پیسے کے لالچ نے وارن ہسٹنگز کو نواب کی مدد پر مجبور کیا۔ اس کے لئے بعد ازاں برٹش پارلیمنٹ میں وارن ہسٹنگز کے خلاف الزام لگایا گیا تھا

ایک مقولہ ہے ۔

রাজা নবকৃষ্ণ আর কি !

راجہ نوکرشن آر کی !

______ راجہ نوکرشن (۱۷۹۷ ۔ ۱۷۳۳) نے شوبھا بازار راج بنس کو قائم کیا تھا۔ یہ اردو اور فارسی زبان کے قابل رشک ماہر تھے ۔ اس کے علاوہ عربی اور انگریزی میں بھی ان کا دخل تھا۔ ۱۷۵۰ء میں وارن ہسٹنگز کے فارسی استاد کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ یہ بنگال کے آخری آزاد نواب سراج الدولہ کی بے دخلی کی سازش کے تمام مرحلوں میں موجود تھے۔ بنگال میں انگریزوں کے اثر و رسوخ کی اشاعت میں جن لوگوں نے عملی طور پر حصہ لیا ان کی یہ آخری کڑی تھے ۔ ۱۷۶۶ء میں لارڈ کلائیو کی کوششوں سے انہیں "مہاراجا بہادر" کا خطاب ملا تھا۔ نوکرشن پہلے گورنر ڈریک کے منشی ہوئے اور بعد ازاں اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدے تک پہنچے تھے ۔ سراج الدولہ کی موت پر اس کے خزانے سے میر جعفر، امیر بیگ اور رام چند رائے کے ساتھ نوکرشن نے بھی آٹھ کروڑ روپئے حاصل کئے تھے۔ راجہ نوکرشن نے اس زمانے میں اپنی ماں کی موت پر دس لاکھ روپیہ خرچ کیا تھا۔ نوکرشن کی ماں کی موت پر جو مجلس منعقد ہوئی تھی اس میں شامل ہونے والے پنڈتوں اور فقیروں کے لئے رہنے کی جگہ اور ساتھ ہی غریبوں کے لئے سرائے قائم کی گئی تھی اور یہی علاقہ شوبھا بازار کے نام سے مشہور ہے ۔

بشنو پور کے راجا گوپال سنگھ کے بارے میں ایک مقولہ ہے ۔

গোপাল সিংহের বেগার।

گوپال سنگھیر بیگار !

سرسری طور پر ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کی مرضی کے خلاف راجا گوپال سنگھ بنا مزدوری کے زور زبردستی اپنے کام کرا لینے کے عادی تھے ۔ اور اسی ضمن میں یہ مقولہ تیار ہوا ہے۔ لیکن بات یہ نہیں ہے۔ گوپال سنگھ بڑے بشنو دھرمی تھے ۔ یہ اٹھارہویں صدی میں بانکوڑا بشنو پور کے راجا تھے ۔ ان کے راج میں سب کو ہری نام کا جاپ کرنا ضروری تھا۔ اگر کوئی ہری نام کرتن میں حصہ نہیں لیتا تو گوپال سنگھ اس پر ڈنڈ لگاتے

اسی لئے الزام اور سرزنش کے خوف سے ہی بہت سارے نوجوانوں کو اپنی مرضی کے خلاف ہری کرتن کرنا پڑتا تھا۔ بشنوپور کے لوگ اس ہری نام کرتن کو ہی "گوپال سنگھیر بیگار" بولتے تھے۔

گوپال سنگھ نے ۱۷۱۲ سے ۱۷۴۸ تک بادشاہت کی۔ ان کے نام سے ایک بشنو شاعری پائی گئی ہے۔ شادی شدہ اور راجا ہونے کے باوجود ایک سنیاسی کی زندگی گذارتے تھے اسی لئے انہیں "راج رشی" کہا جاتا تھا۔ گوپال سنگھ ایک سریلے کرتن گایک بھی تھے۔ بشنوپور کے پانچ خوبصورت مندروں کی تعمیر بھی انہوں نے کی تھی۔ انہیں کے دورِ حکومت میں بشنوپور پر مراٹھا فوج نے بھاسکر پنڈت کی قیادت میں حملہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے بشنوپور کے بڑے دیوتا نے باجا گاجا اور تیر کمان کی مدد سے دشمن کی فوج کو بھگا دیا تھا۔

ایک مقولہ بنگال کے آخری آزاد نواب سراج الدولہ سے متعلق ہے۔

নবাব সিরাজুদ্দৌলা আর কি!

"نواب سراج الدولہ آر کی !"

——— سراج الدولہ (۱۷۳۰-۱۷۵۸) کے نام سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں پھر بھی ان کے سلسلے میں کچھ ضروری باتیں لکھ دینا مناسب ہے۔ یہ نواب علی وردی خاں کی بیٹی کے لڑکے تھے۔ ان کے والد کا نام زین الدین احمد اور ماں کا نام آمنہ بیگم تھا۔ علی وردی خاں کے وارث کی حیثیت سے ۱۷۵۶ء میں بنگال، بہار، اور اڑیسہ کے نواب ہوئے۔ ۲۷ جون ۱۷۵۸ء میں پلاسی کے میدان میں میر جعفر کی سازش کا شکار ہو کر انگریزوں سے شکست کھائی اور قیدی بنا لئے گئے۔ بعد ازاں میر جعفر کے لڑکے میرن کے حکم پر محمدی بیگ کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے۔

مالوہ کے پرشکوہ حکمراں اور گیارہویں صدی کے راجا بھوج کو بھی لیکر ایک مقولہ ہے۔

কোথায় রাজা ভোজ, কোথায় গঙ্গারাম তেলী!

"کوتھائے راجا بھوج، کوتھائے گنگارام تیلی !"

راجہ رجواڑوں کے بعد سپہ سالاروں کے بارے میں مقولوں پر تبصرے کے آغاز میں ایک مقولہ یوں ہے۔

শঙ্কর চক্রবর্তীকে খেলে বাঘে,
অন্যলোকে কোথা লাগে।

"شنکر چکرورتی کے کھیلے باگھے۔

اپنے بوکے کو کھانے لا گے"

شنکر چکرورتی بنگال کے آخری بارہ بھومیاں، جیشور کے راجا پرتاپ دتیہ کے لڑاکین کے ساتھی تھے۔ بعد ازاں بہادر سپہ سالار کے طور پر کافی با اثر ثابت ہوئے تھے۔ مغل فوجوں کے مقابلے میں انہوں نے ہمیشہ اپنی بہادری کی لاج رکھی تھی۔ اسی وجہ سے امبر کے راجا مان سنگھ نے بھی ان کی بہادری کی تعریف کی تھی۔ بہت سے لوگ ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ بنگالی کمزور ہوتے ہیں ــــــ یہ نظریہ کتنا بے مایہ ہے شنکر چکرورتی کی یہ شاندار روایت ثبوت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ متذکرہ مقولے میں شنکر چکرورتی کی اسی روشن حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس جیسا ایک اور مقولہ ہے۔

বেরূপাক্ষের কাটা, কালাপাহাড়ের কাটা!

" بیروپاکھیر کاٹا ، کالا پہاڑیر کاٹا "

ــــــ یہ کالا پہاڑ سکندر سور کے بھائی تھے۔ بنگال کے کرانی خاندان سے تعلق رکھنے والے سلطان سلیمان اور ان کے بیٹے داؤد کے یہ کالا پہاڑ سپہ سالار تھے۔ کوچ راج شوکل دھج نے جب بنگال پر حملہ کیا تو انہوں نے اسے شکست دیکر قیدی بنا لیا تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر کے خلاف ۱۵۸۳ء میں بنگال اور بہار میں جو بغاوت ہوئی تھی اس میں کالا پہاڑ نے حصہ لیا تھا۔ اور اسی جنگ میں مارے گئے تھے۔ ۱۵۶۸ء میں انہوں نے پوری پر حملہ کیا تھا اور جگن ناتھ جی کے مندر کو تباہ کر دیا تھا۔ ان کے سلسلے میں لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ برہمن خاندان میں جنم لے کر بھی یہ بعد ازاں مسلمان ہو گئے تھے اور طاقت ور ہندو دشمن کے طور پر اپنے آپ کو ثابت کیا تھا۔

اس دیش میں جن انگریز حکمرانوں کا تعلق عوام سے زیادہ رہا ہے ان میں وارن ہیسٹنگز آخری حکمراں تھے۔ بہت سارے انگریز حکمراں آئے مگر بنگلہ مقولوں میں جس نے جگہ بنائی وہ صرف وارن ہیسٹنگز تھے۔

হাতী পর হাওদা. ঘোড়া পর জিন
জলদি আও ওয়ারেন হেস্টিন!

" ہاتھی پر ہودا ، گھوڑے پر زین
جلدی آؤ ، جلدی آؤ ، وارن ہسٹین "

ــــــ ۱۷۳۲ء میں وارن ہیسٹنگز پیدا ہوئے۔ صرف آٹھ برس کی عمر میں یعنی ۱۷۵۰ء میں ایسٹ انڈیا

کمپنی میں کلرک ہو کر ہندستان آئے ۱۷۵۶ میں سراج الدولہ کے ہاتھوں قید کئے گئے۔ ان کے کام سے خوش ہو کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے انہیں گورنر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ ۱۷۷۲ میں یہ بنگال کے گورنر ہوئے انہیں کی سازش سے مہاراجا نند کمار کو پھانسی ہوئی۔ ۱۷۸۵ میں ہندستان چھوڑ کر چلے گئے۔ ولایت پارلیمنٹ میں ان پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے ہندستان میں طرح طرح کے ظلم اپنے دورِ حکمرانی میں روا رکھے تھے تقریباً سات سال تک معاملہ چلتا رہا آخر ۱۷۹۵ میں انہیں بری کر دیا گیا۔

ایک مقولہ ہے ۔

রঘু চৈতা বলা,

এ তিন কালির চেলা!

" رگھو، چیتیا، بلا

اے تین کالیر چیلا !"

۔۔۔۔۔ اس مقولے میں تین تاریخی ہستیوں کا ذکر ہے۔ یہ تین اشخاص ۔۔۔۔۔ رگھوناتھ شیرومنی، چیتنیہ مہاپربھو اور رگھوناتھ شیرومنی کا گھر شری ہاٹ کے پنج کھنڈ میں تھا۔ ۔۔۔۔۔ بلا سین ۔۔۔۔۔ باپ کا نام گوبند چکرورتی اور ماں کا نام سیتا دیوی تھا۔ بچپن میں ماں کے ساتھ نودیپ آئے اور رگھوناتھ باسو دیب نام کے ایک مشہور رنج کے گھر میں رہنے لگے اور انہیں کے محلے میں پڑھائی لکھائی کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ نودیپ میں شری چیتنیہ دیو ان کے شاید ہم سفر تھے۔ نودیپ میں اپنی تعلیم ختم کر کے رگھوناتھ میتھیلا چلے گئے وہاں پر انہوں نے پکھو دھر مشرا کے پاٹھ شالے میں تقریباً ایک سال تک تعلیم حاصل کی۔ اس وقت میتھیلا کی رسم تھی کہ کوئی طالب علم وہاں سے کوئی کاپی لکھ کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس لئے رگھوناتھ تمام کاپیوں کو زبانی یاد کر کے نودیپ واپس لوٹے۔ نودیپ آکر انہوں نے خود پاٹھ شالہ قائم کیا اور اس کے بعد بالکل نئی تعلیم شروع کر دی۔ ہندستان کے مختلف علاقوں سے طالب علم ان کے پاٹھ شالے میں تعلیم حاصل کرنے آتے۔ رگھوناتھ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں

(۱) پدارتھ کھنڈن (۲) آتم تتو۔ دلویک ٹیکا (۳) گرامانیہ واد (۴) لیلاوتی ٹیکا۔ (۵) شبد منا دیدھتی وغیرہ مشہور ہیں ۔۔۔۔۔ تقریباً پندرھویں صدی عیسوی کی نصف صدی میں جنم لے کر یہ سولہویں صدی کی نصف تک زندہ رہے چیتنیہ کے ساتھی نتیانند کے ۔۔۔۔۔ ہری نام ۔۔۔۔۔ اور رگھوناتھ کی ۔۔۔۔۔ نئی تعلیم ۔۔۔۔۔ کی وجہ سے اس وقت اس دیش میں خاطر خواہ جاگ جوگ اور مختلف مذہبی مجلسیں قابلِ ذکر حد تک کم ہو گئیں۔ اسی لئے سناتن دھرم کے ہندو محافظ انہیں اچھی نظر

سے نہیں دیکھتے ہیں۔ ان پر دھرم مخالف کے طور پر ہی تبصرہ کیا جاتا۔ اسی ذہن کو متذکرہ مقولے میں منعکس دیکھا جا سکتا ہے۔

اس مقولے میں رگھوناتھ شرومنی کے ساتھ چیتنیہ دیب کا نام بھی لیا گیا ہے۔ چیتنیہ ۸۶-۱۴۸۵ء میں پیدا ہوئے ان کی جائے پیدائش ضلع ندیا کے نودیپ دھام میں ہے۔ باپ کا نام جگن ناتھ مشرا تھا۔ باپ کا دیا ہوا نام بشمبھر تھا۔ صرف ۲۴ برس کی عمر میں وہ کیشب بھارتی کے ہاتھوں سنیاس دھرم سے آشنا ہوئے۔ یہ ایشور پوری سے بھی گوپال منتر سیکھے۔ گوڑ (بنگال، بہار، اڑیسہ) میں اس نے بسنو دھرم شروع کیا۔ چیتنیہ کے پریم دھرم نے دیوتا کو ایک آدمی کی طرح عوام کو روشناس کرایا۔ ان کے نزدیک آدمی ہی میں دیوتا اظہار رہتا ہے۔ ان کے مذہب میں' ذاتی دھرم' بھرم اور تعصب کے ساتھ سب انسان ہی ایشور کے سنتان کے روپ میں نظر آتے ہیں ایشور کی آرادھنا کرنا سب کا حق ہے اس کے لئے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ دیوتا پوجا کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی رسومات (بلی دینا، ناچ، گانا وغیرہ) کو انہوں نے بے معنی گردانا۔ چیتنیہ دیب کی موت ۱۵۳۳ء میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مقولے میں ان کو بھی مذہب مخالف کے طور پر برتا گیا ہے۔ سب سے آخر میں بلال سین کا نام آیا ہے۔

تقریباً ۱۱۵۸ء میں بجے سین کی موت کے بعد بلال سین تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے گوڑ کے راجا گوبند پال کو شکست دے کر مگدھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ باپ کی زندگی ہی میں انہوں نے میتھیلا پر قبضہ کر لیا۔ بلال سین نے اپنی حکومت کو ــــــ راڑھ، بریدر، باگڑی، بنگ اور میتھیلا ــــــ پانچ حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اور "اری راج نیشنکہ شنکر" کا خطاب اپنایا تھا۔ بلال سین مختلف فنون کے مالک تھے گرو انیر ودھ سے انہوں نے وید، سمرتی، اور پران وغیرہ بہت سے شاستروں کا علم حاصل کیا تھا۔ یہ خود ہی یوگ، یگیہ جیسے مذہبی محفلوں کے مشہور شاستر وادی پنڈت تھے۔ برت ساگر، آچار ساگر دان ساگر وغیرہ پانچ کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ بڑھاپے میں انہوں نے اپنے بیٹے لچھمن سین کو راج پاٹ سونپ کر اپنی بیوی کے ساتھ تربینی کے نزدیک گنگا کنارے بان پرستھ میں اپنے آخری دن گذارے۔ لیکن مقولے میں ان کا ذکر دوسرے معنوں میں ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے بنگالیوں میں کولن ذات یا سسٹم شروع کیا۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مقولے میں ان کے خلاف ہی نظریہ کی اشاعت ہوئی ہے کہ انہوں نے سناتن دھرم کو برباد کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔

ذات اور دھرم کی بربادی کا رونا ایک دوسرے مقولے میں اس طرح رویا گیا ہے۔

ইস্টিসেন, কেশবসেন, উইলসেন
তিন সেনেতে জাত মারলেন

"اسٹی سین، کیشب سین، اویل سین
تن سے نے تے ذات مارلین!"

اسٹی سین سے ریل گاڑی مراد ہے، اور اویل سین ہیں ایک ہوٹل والے۔ ہوٹل میں تمام ذات کے لوگ ہی کھاتے پیتے ہیں۔ لہٰذا اویل سین کو ذات مارنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ کیشب سین کو برہمو دھرم کو پھیلانے میں صف اول کا رہنما گردانا گیا۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۸ء میں ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں انہوں نے برہمو سماج اختیار کیا۔ درشن اور دھرم کے معاملے میں ان کو خاص معلومات حاصل تھیں۔ یہ شری دیویندر ناتھ ٹھاکر کے چہیتے تھے غیر معمولی صنف گویائی کے حامل اور دیش پریمی ہونے کی وجہ سے یہ پورے ملک میں مشہور تھے۔ مختلف سماجی کاموں میں بھی ان کا بہت ہاتھ تھا۔ شراب پینے کے خلاف، ایک سے زائد شادی کرنے کے خلاف اور بچپنے کی شادی کے خلاف آندولن میں بھی ان کا رول رہا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں انہوں نے بھارت ورش برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۷۰ء میں کیشب چندر دھرم کی اشاعت کے لئے ولایت گئے۔ وکٹوریہ انسٹی ٹیوشن اور البرٹ ہال کی بنیاد بھی انہوں نے ہی ڈالی تھی برہمو دھرم کی اشاعت اور ہندو دھرم کی مخالفت کے تعلق سے مقولے میں ان کا ذکر ذات نشٹ کرنے والوں میں کیا گیا ہے۔

ایک آخری مقولہ ہے:۔

ধনীর মধ্যে অগ্রগন্য রাম দুলাল সরকার
বাবুর মধ্যে অগ্রগন্য প্রাণকৃষ্ণ হালদার ।।

"دھنیر مدھے اگرگنیہ رام دولال سرکار
بابور مدھے اگرگنیہ پران کرشن ہلدار"

بنگالیوں کی آزاد صنعت کاری کی قیمت و تجارت کے معاملے میں رام دلال سرکار ایک مشہور نام ہیں۔ ان کی پیدائش ہوئی تھی ۱۷۵۲ء میں۔ بچپن ہی میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے ان کی پرورش اپنی نانی کے ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ نانی تھیں اس زمانے کلکتہ میں اس زمانے کے ایک مشہور تاجر مدن موہن دت کے گھر کی کھانا پکانے والی۔ نانی کی وجہ سے ہی رام دلال کو مدن موہن کا پیار ملا۔ اور تھوڑی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی مدن موہن کی گدی پر دس روپیہ ماہانہ تنخواہ پر کام کرنے لگے۔

ایک مرتبہ مدن موہن نے انہیں ایک نیلام حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ رام دلال وہ نیلام حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ مگر اس کے علاوہ چودہ ہزار روپیہ میں ایک ڈوبا ہوا جہاز خرید لیا اور اسے ایک صاحب کے ہاتھوں مزید ایک لاکھ روپیہ میں فروخت کر دیا۔ اس کے بعد تمام روپیہ ہی رام دلال مدن موہن کو دینے کے لئے چل پڑے لیکن مدن موہن نے تمام روپیہ نہیں لیکر ایک لاکھ روپیہ کا منافع رام دلال کو دان کر دیا۔ اس بات کا ذکر چنداں ضروری نہیں کہ وہ رام دلال کی سچائی اور تاجرانہ عقل مندی سے بہت زیادہ حیرت زدہ ہوئے تھے۔ غرضکہ رام دلال نے مدن موہن سے ایک لاکھ روپیہ حاصل کرنے کے بعد آزادانہ طور پر تجارت شروع کی اور بہت کثیر دولت کے مالک ہوئے۔ انہیں کی وجہ سے ۱۸ ویں صدی کے آخری دنوں میں امریکہ کے ساتھ بنگال کا زرعی تعلق ہوا۔ امریکہ کے ایک تاجر نے رام دلال کے نام ایک جہاز کا نام رکھا تھا جس کے ذریعہ حاصل کی ہوئی آمدنی عوام الناس کی بہبودی کے لئے خرچ کی جاتی تھی۔

پران کرشن ہلدار بابو ٹائپ کے ایک آدمی تھے۔ مجلسی زندگی کے شوقین، راگ ورنگ کے عاشق اور ساتھ ہی دوسروں کے دکھ درد سے دلچسپی رکھنے والے شخص کے طور پر کافی شہرت کے مالک تھے۔ ظاہر ہے کہ متوفے میں ان کی شمولیت کی وجہ بڑی معقول تھی۔

ھندی نظم

شاعر: سروپشور دیال سکسینہ

معاف اسکو نہ کرنا تم

احمد سلیم

21/3, Bashiruddin Munshi Lane
Howrah- 711101

لگی ہو آگ جب گھر میں
تو کیا تم
خواب شیریں کا مزہ لو گے
پڑی ہو لاش جب گھر کے کسی کمرے میں تو کیا تم
کسی اک شے دوسرے کمرے میں جاکر
گیت گاؤ گے
خوشی کے راگ الاپو گے
عمر رفتہ کو پکارو گے
اگر اک دوسرے کمرے میں لاشیں سڑ رہی ہوں
تو کیا تم
بیچ آنگن میں
مصلّے پر عبادت میں مگن ہو گے
اگر تم ہاں کہو گے تو
مجھے اب کچھ نہیں کہنا

کوئی بھی ملک کاغذ پر بنا نقشہ نہیں ہوتا
کہ اس کا ایک حصّہ پھٹ بھی جائے تو
بقیہ حصّے سالم ہوں
ندی، پربت، نگر اور گاؤں
آنکھیں موندے،
بلا سے آنکھیں ہی موندے دکھائی دیں
اگر اس بات سے انکار ہے تم کو
تمہارے ساتھ اب مجھکو نہیں رہنا

کہ اس دنیا میں انساں سب سے بڑھ کر ہے
اور اس کی جان سے بڑھ کر نہیں کچھ بھی
نہ ایشور ہی
نہ اس کا علم و دانش ہی
الیکشن
اور آئینِ حکومت بھی
یہاں تک
ملک کا دستور بھی اس سے نہیں بڑھ کر
کہ انساں سب سے افضل ہے
اور اس کے نام پر
کاغذ پہ لکھی کوئی بھی تحریر، عبارت
پھاڑی جا سکتی ہے
زمیں کی سات پرتوں میں عبارت
گاڑی جا سکتی ہے
کھڑا ہے جو شعور اک لاش کے اوپر
زندہ نہ رہتا ہے

نقشہ مملکت چلتا ہے جو بندوق کے دم سے
وہ دھندا ظالموں اور قاتلوں کا ہے
مری اس بات سے انکار کرتے ہو
تو مجھکو ایک پل بھی اب نہیں سہنا

کہ بچے قتل ہوں
بے آبروئی عورتوں کی ہو
کوئی بھی گولیوں سے چیتھڑا جسم
نہیں شمشان کا
بلکہ
اسے اعلانیہ سمجھیں گے ہم قومی تنزّل کا
اور یہ بھی یاد رکھو
اس طرح یہ خون بہہ کر
جذب ہو جائے گا دھرتی میں
کبھی ایسا نہیں ہوتا
لہو آواز دیتا ہے
بلند آکاش میں لہراتے جھنڈوں کو بھی جا کر
تھام لیتا ہے
کہ جس دھرتی کو بوٹوں کے تلے روندا گیا ہو
اور جس دھرتی پہ لاشیں گر رہی ہوں
وہ دھرتی گر تمہارے خون میں
اک آگ بن کر ہو نہ رقصاں تو
سمجھ لو
ہو گئے ہو سر بسر بنجر
نہیں ہے اختیار اب سانس لینے کا تمہیں کوئی

اور اس دنیا میں تم کو
ایک پل بھی اب نہیں رہنا

اور آخر میں
مری یہ بات بھی سن لو
معاف اس کو نہ کرنا تم جو قاتل ہے
وہ چاہے یار ہو
مذہب کا ٹھیکیدار ہو کوئی
کہ ہو جمہوریت کا نام لیوا
معتبر ہو یا وہ پہرے دار ہو کوئی
معاف اس کو نہ کرنا تم

ھندی نظم

شاعر: کمار امبج
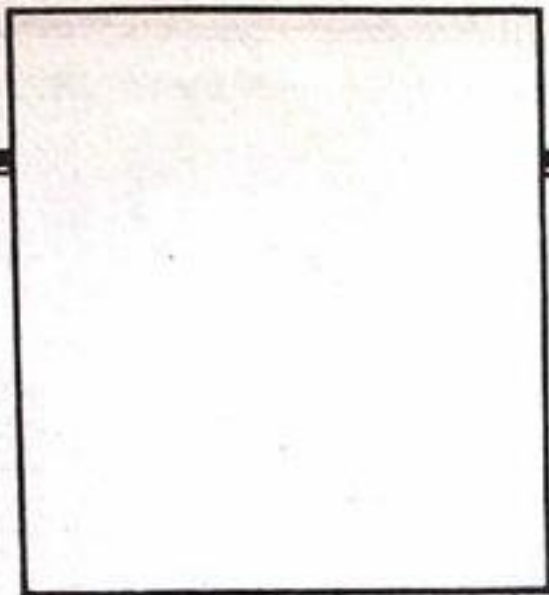
کوئی نہیں مرنا چاہتا

اقبال کرشن

نہ برسات کی کائی
نہ گرمیوں کی گھاس
نہ جھینگر کی آواز
نہ جگنوؤں کی روشنی
یونہی کوئی نہیں مرنا چاہتا

ناگ پھنی کا سب سے ننھا کانٹا
ناپید ہو رہی نسل کا ہرن
یا فرش کے نیچے دبکا لال بیگ
سب جینا ہی چاہتے ہیں
یہ زندگی پوری

بس ٹھیک طرح جینے کی چھوٹی چھوٹی خواہش
ہو جاتی ہیں مضرت رساں
ورنہ جتنے سبھی مرے ناوقت
وہ کب مرنا چاہتے تھے اس طرح
وہ سب کے سب تو
دوسروں کی سفاکیوں کی چٹانوں کے بیچ
دب کر مارے گئے

یوں ہی نہیں مرنا چاہتا کوئی!

اس کی موت

سنجے بھالوٹیہ

آسمان کے نیچے اِس افق سے اُس افق تک
پوٹاشیم سائنائڈ کا زہر سب سے تیکھا ہے
زبان پر آیا اور کام تمام
ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی نہیں لگتا
زبان باہر نکل آتی ہے
گردن لٹک جاتی ہے
آپ چاہیں یا نہ چاہیں بچے سب کچھ جان جاتے ہیں
وہ مرنے کی ہلکی پھلکی اداکاری کرتے ہیں
پوٹاشیم سائنائڈ کی باتوں میں زہر بھرتے ہیں
لیکن کسی کی موت نہیں ہوتی
پھر پوٹاشیم سائنائڈ کو اپنے لاشعور میں رکھ کر
وہ بڑے ہو جاتے ہیں
عمر، علم، آگہی اور تجربے سے نہیں
فریج، ٹی وی، وی سی آر سے
قالین سے
جھاڑ فانوس سے
خوبصورت شریکِ حیات سے
چالاک بچوں سے
لیکن ان کے اندر کچھ مرا ہوا ہے
وہ لاعلم رہتے ہیں
ان کے اندر جو کبھی سانس لیتا تھا
وہ پوٹاشیم سائنائڈ سے نہیں
اس کی موت کا سبب کچھ اور ہے
جسے وہ پہچان نہیں پاتے
وہ تِل تِل مرتے ہیں
یا مارے جاتے ہیں

سنجے بھالوٹیہ

آنکھیں ہیں، سپنا ہے

آنکھیں ہیں سپنا ہے
بیچ میں کچھ ہے جو اپنا ہے
میں نے بھی سجایا ہے
ایک شہر
پورا کا پورا
پھر بھی مجھے لگ رہا ہے کہیں سے ادھورا
میں نے اپنے سپنوں کو جھالر کی طرح
چاند پر ٹانگا ہے
کسی اور کو نہیں
خود سے خود کو مانگا ہے
میں سناٹے کی طرح بہتا ہوں
سپنوں کو پھوس کی طرح جلتے
اور موم کی طرح پگھلتے
دیکھ کر
میں اپنی آنکھوں سے کچھ کہتا ہوں
نہیں میں خاموش رہتا ہوں
میں خاموش رہوں گا
دکھ سہوں گا
اس صدی کے انت تک
اور آگے
اور آگے بھی

ھندی نظم

اردو ترجمہ: احمد تنویر

بہروپیا

راویل پشپ

مجھے اب بھی یاد ہے کہ بچپن میں
وہ کبھی کبھی دروازے پر آتا تھا
کسی دن بھکاری بن کر
کبھی پجاری اور کبھی مداری بن کر
کبھی کسی چور کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال کر
کبھی کبھی وہ بارعب سپاہی بھی بن جاتا تھا
ماں نے بتایا تھا
کہ وہ ایک بہروپیا ہے
اس طرح وہ تماشے بن کر
تماشے دکھاتا
اور سب کا جی بہلاتا
آخر میں لوگوں سے مانگ مونگ کر
اپنی روٹی چلاتا

آج اچانک نہ جانے کیسے وہ بہروپیا
میرے ذہن میں نئے امکانات بن کر
کوندجاتا ہے
اور میں اپنی پوٹلی میں رکھ لیتا ہوں
ایک "جنیو"
ایک کراس
ایک پگڑی
ایک فروالی ٹوپی
تھوڑی سی داڑھی مونچھ
گھر سے نکلتے وقت
حسبِ معمول بیوی دروازے تک آتی ہے
اور ایک بار پھر
خوف اور اندیشے سے بھر جاتی ہے
شہر میں
دنگے کا ماحول ہے
ذرا سنبھل کر جانا
اور تمہیں منّے کی قسم
شام ڈھلتے ہی لوٹ آنا
میں اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہوں
اور جھٹکے سے چلا جاتا ہوں

ہر محلے میں کھیل دکھاتا ہوں
کہیں تلک لگاکر
"جنیو" پہنتا ہوں
کہیں گڈ مارننگ کہہ کر
کراس کرتا ہوں
کہیں السلام علیکم
اور کہیں ست سری اکال
دیکھو تو دھرم کے پرستاروں کا کمال
میں بخیر و خوبی روٹی کے ٹکڑے لے کر
گھر واپس آتا ہوں
اور سارے دھرموں کے آگے
سر جھکاتا ہوں
کہ تم نے مجھے آج آدمی نہیں
ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی بنادیا ہے
سچ مچ تم نے کیا سے کیا کردیا ہے
میں
تم
یعنی ہم
اب آدمی نہیں
سب کے سب بہروپیے ہیں

ہندی نظم

اردو ترجمہ : احمد تنویر

جنگل ہنس رہا ہے

ستیہ نرائن

ہر چیخ سے بے اثر بستی گاؤں
جنگل ہنس رہا ہے
لے گئی کالی ہوا
سارا ہرا پن ساتھ
پیڑ نربنسی کھڑے گم سم
جھکائے "ماتھ"[1]
اب نہیں تٹ پر ندی کی چھاؤں
"مروستھل"[2] ہنس رہا ہے

اس طرح ٹھہرا ہوا ہے "پوکھرے"[3] کا جل
لاکھ مارو کنکری ہوتی نہیں ہلچل
دھنس گئے ہیں کیچ میں اب
دھوپ کے بھی پاؤں

میل کے پتھر کھڑے ہیں
راہ سے ہٹ کر
رہ گیا گھر
صرف کمروں میں یہاں بٹ کر
بک رہا سونا
گیلٹ کے بھاؤ
پیتل ہنس رہا ہے

---

[1] سر [2] صحرا [3] تالاب
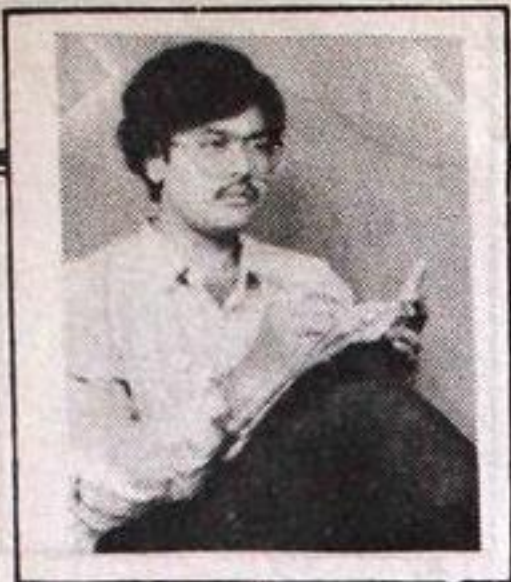
کباب

آنند بہادر

"سچّا دھرم وہی ہے جو انسان کو آسان بھوجن مہیّا کرائے" وہ بڑبڑایا۔
اور آسان بھوجن سستا بھوجن ہوتا ہے۔
اس نے سر اٹھا کر رمضانی کو دیکھا اور مسکرایا۔ "ایک ہاف پلیٹ رائیس اور چار سیخ کباب" اس نے آرڈر دیا۔
ایسا کچھ اس کے دماغ میں کئی دنوں سے گھوم رہا تھا۔ مگر رمضانی کے ڈھابے میں آج جب وہ کھانے بیٹھا تو اچانک یہ خیال پختہ ہو گیا۔
یہی ہوتا ہے۔
آپ کسی بات کو لے کر دبدھا میں رہیں پھر اچانک کوئی ایک بات تیر کی طرح سنسناتی ہوئی آکر حلق سے چڑھ جاتی ہے، اور آپ ہو جاتے ہیں حلال۔
شیکھر جانتا تھا کہ اس کا دماغ پرندے کی طرح اڑنے ہی والا ہے۔
یہ کام وہ تین مہینے سے کر رہا تھا۔ دھرم بھرشٹ ہوئے وہ نوّے دن، اس پر بھی، کل ملا کر نوّے بار اتنا سستا کھا چکنے کے بعد بھی اسے یقین نہیں آتا۔
یقین نہیں آتا کہ محض تین روپے پچیس پیسے میں کوئی چار چار سیخ کباب اور رائیس بھی کھا سکتا ہے۔
نان ویج۔ رائیس کے دو روپے پچیس پیسے اور پچیس پیسے فی سیخ کباب یعنی کل ملا کر صرف تین روپے پچیس پیسے۔ تین روپے پچیس پیسے میں ٹھاٹ۔

آج شیکھر کے من میں اچانک یہ خیال جاگا کہ ابھی جاکر اپنے کٹّر "گرم کانڈی" بابوجی سے بحث کرے۔
جس دیش میں آپ کی گوماتا "سب سے پوجنیئے ہے۔ وہاں جانتے ہیں بابوجی۔
سستا بھوجن کیا ہے؟
اور آپ لاکھ کہئے مگر غریب آدمی کے لئے سب سے اچھا دھرم وہی ہے جو سب سے سستا کھانا فراہم کرا سکے۔
غریب آدمی کی جیب میں پیسہ بہت کم ہوتا ہے نا۔ اس لئے۔
آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شیکھر کے پتا کیا جواب دیتے۔
اور بھی بہت سارے لوگ ناراض ہوں گے۔ مگر زور مارئیے تو لگے گا کہ گومانس سب سے پوجنیئے بھوجن ہونا چاہیے۔
شیکھر خود کو غریب آدمی مانتا ہے، اس لئے "دھارنیتی ایتی دھرما"
(جو دھارن کرتا ہے وہی دھرم ہے) آدمی انگنت پرندوں، مچھلیوں، مینڈکوں کیڑوں اور جانوروں کو کھا کر ہضم کرلیتا ہے، پھر جتنا بڑا جانور کھانے کے لئے مارا جائے، اتنی ہی کم جیو ہتیا لگے۔
ایک بیل کا مارا جانا ایک بچھڑے کے مارے جانے سے بہتر ہے، اور ایک بکرے کا مارا جانا ایک مرغے کے مارے جانے سے کہیں اچھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم ایسی بندوبست کرسکیں جس سے تعداد ٹھیک رہے تو ہمیں جانوروں میں ہاتھی اور پرندوں میں گدھ کو اپنی خوراک بنانی چاہیے۔
شیکھر سوچتا چلا گیا۔
نصیب گنج چوراہے سے لگ کر رمضانی کا ڈھابا ہے، معمولی سا، جیسا قصباتی علاقے میں ہوتا ہے، یوں بھی ایک قصبہ سا ہے لائق پور، جہاں کافی تعداد میں مسلمان رہتے ہیں اس لئے ان کے لائق ایسے کئی ڈھابے یہاں ہیں، لکڑی کے بنچ بچھے ہوئے ہیں جن پر بیٹھ کر غریب طبقے کے لوگ بھات کباب، یا کوفتہ روٹی کھاتے ہیں۔
خصّی کا گوشت بھی مل جائے گا، لیکن وہ کافی مہنگا پڑتا ہے،
شیکھر کو ان دنوں لائق پور میں کوئی نہیں جانتا تھا، تین مہینے قبل ہی تو وہ یہاں آیا تھا، نہ کوئی خاص جان نہ پہچان۔ اس لئے کسی بھی طرح کا کھانا کھانے، کپڑے پہننے، چال چلن اپنانے کی آسانی تھی، رمضانی تو پہلے ہی دن سے اسے مسلمان سمجھنے لگا تھا۔
گریجویشن کے بعد شیکھر کو کام پر لگ جانا پڑا۔ گھر کی حالت اچھی نہیں تھی، کچھ مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھا مگر ناکام رہا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بابوجی کے دوست گوردھن بابو نے لائق پور میں میڈل اسکول میں لگوا دیا تو وہ آکر ٹیچری کرنے لگا، غیر منظور شدہ اسکول میں تین سو پچاس روپے۔ ساتھ میں کچھ پیسے

ٹیوشن سے کل ملا کر ساڑھے چھ سات سو روپے ماہانہ، چلو گھر کی بک بک اور لوگوں کے طعنوں سے پیچھا تو چھوٹا،

"پیچھا چھوٹا" ہنہہ،

شیکھر بدبدایا،

"جنیو سے بندھا آدمی ایسا کھانا کھا کر پوری طرح کبھی سمسیاؤں سے چھٹکارا نہیں پا سکتا.... کبھی کبھی کھانا حلق میں اٹکتا سا معلوم پڑتا ہے، کبھی کبھی لگتا ہے جیسے کوئی عجیب سی لجلجی چیز کھا رہا ہوں، کبھی کبھی الکائی سی آنے لگتی ہے........"

"مگر حبیب کا خیال سبھی اوٹ پٹانگ سمسیاؤں سے ضروری لگتا ہے"

"گوماتا سچ مچ ماتا ہے ماتا آج تمہارے ہی چلتے سات سو روپلی میں ٹھاٹ سے جی رہا ہوں۔" وہ من ہی من میں ہنسا اور ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔

رمضانی کا ہوٹل بڑا کارآمد ہے، ایسے علاقے میں اس کا ہونا جہاں زیادہ ہلچل نہیں ہوتی، مسجد پاس ہی ہے، اس لئے ہندو تھوڑا کم ہی نظر آتے ہیں۔ اس پر سے دنگوں والا، فرقہ پرستوں کا شہر جو ٹھہرا پھر بھی، شیکھر ڈھابے میں گھستا تو اسے لگتا جیسے کوئی اسے ہی دیکھ رہا ہو، بہت پھرتی سے، جھٹ پٹ ہوٹل میں وہ گھسا اور نکلا کرتا۔

پچھلے کچھ دنوں سے شہر کا مزاج کچھ بگڑا ہوا تھا ایک سنسنی سی فضا میں تھی، لگتا تھا جیسے ہر کوئی کچھ سوچ رہا ہو، ایک چھوٹے سے تخم کی بات تھی، چار پانچ برس پہلے مدرسے کے پاس ہریجن کی زمین ہوا کرتی تھی، ایک دن ہریجن اپنا کوئی وارث چھوڑے بنا مر گیا "زمین یوں ہی خالی" یتیم پڑی رہی کچھ دنوں تک زمین پر ہندو مسلمان، دونوں کی نظر تھی، ایک رات کسی نے وہاں نارنجی رنگ کا پتھر رکھ دیا، پھر کچھ بھگت جٹے، ایک تیکونا پھریرا ہوا میں لہرایا، پھر ہر منگل اس پتھر پہ ناریل پھوڑا جانے لگا۔ ان سارے واقعات کو مسلمانوں نے بہت مشتعل ہو کر دیکھا۔

حد تو تب ہوئی جب پچھلی رام نومی کو وہاں پر باقاعدہ ہنومان جی کو استھاپت کر دیا گیا۔ اس دیس میں جہاں سرکاری پرایوجت کاریہ کرموں کے بھوارجن یدا ادھیکاری گاہے بہ گاہے مجبور جنتا کی زمین ہڑپتے ہوئے اسے تکڑے تباہ کیا کرتے ہیں، وہاں سے سب سے بڑے بھوارجن یدا ادھیکاری پون پتر جی نے نزک لوک باسی ہریجن کی زمین کو ہڑپ لیا۔

مسلمان فریاد بھلا کس سے کرتے؟ ایسے معاملوں میں اڈوانی جی کی قسم، پرشاسن ذرا پنگو ہو جاتا ہے

لہٰذا وہ محمد کے دربار میں گئے۔ کرم دیکھئے کہ اگلے جمعہ کو پرتیما غائب ہو گئی۔
ایس پی اپدھائے فوراً ایکشن میں آ گئے۔ دو تین مسلمان شہیدوں کو بٹورا اور ان کی خوب دھنائی کی گئی۔ پرتیما برآمد ہوئی تو اس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ شہر میں تناؤ ہو گیا۔
یہ تناؤ کیا ہے؟ اور کیسے ہو جاتا ہے؟ شاید یہ ٹھیک ٹھیک کوئی نہیں جانتا مگر اچانک ایسا ہوتا ہے کہ خود بخود لوگوں کو پتہ چلتا ہے۔ شہر میں تناؤ ہے۔
پھر ہر شخص اس تناؤ کو محسوس کرنے لگتا ہے، جھیلنے لگتا ہے، اچانک ہوائیں گرم ہو جاتی ہیں، ناکیں پچکنے لگتی ہیں، دم گھٹنے لگتا ہے، ہلکی پھلکی تکراریں شروع ہوئیں۔ پرشاسن نے ۱۴۴ کا سہارا لیا، دونوں طبقوں کے کچھ چنندہ لوگوں کو نمونے کے طرز پر چھانٹ کر اندر کر دیا، چلئے معاملہ شانت ہوا، مگر ایسے معاملے شانت بھی ہوتے ہیں بھلا۔
چالیس فیصد کے چار اور ساٹھ فیصد کے چھ جیل میں اور شہر کی آتما پر ایک بدنما دھبہ،
۱۴۴ ہٹنے کے اگلے دن شیکھر رمضانی کے ہوٹل میں بیٹھا کھا رہا ہے۔ ساتھ ہی سوچتا ہی جا رہا ہے، سوچتا ہی جا رہا ہے، معاملہ ارتھک دشا سے شروع ہوا، پھر تو وہ دبدھا میں ایک پر ایک چراغ روشن کرتا گیا۔ آخر ہندو دھرم کا مول ویدوں میں ہے اور ویدوں میں پراچین آدیاؤں کے بارے میں اس معاملے پر کافی ثبوت موجود ہے.........
باہر گرمی کی تیز لو چل رہی تھی، سڑک پر آمدورفت کا سلسلہ "نہ" کے برابر تھا۔ دبدھا دھرم کو لے کر تھی، مگر وہ اپنی آتما کی طرف سے لگاتار مطمئن ہوتا چلا جا رہا تھا، ڈنگائی شہر میں رہ کر وہ ایسا کر پا رہا تھا، جب کہ شہر کے دانشور ایسا نہیں کر پا رہے تھے۔
شیکھر کھا کر اور تین پچیس چکا کر نکل گیا ایک ڈنگائی شہر میں برہمن بالک کا اپنے عمل کا احساس اسے مزے دار لگا نکلتے وقت وہ گنگنانے لگا۔
شیکھر کو پتہ ہوتا تو وہ نہیں گنگناتا کیوں کہ معاملہ نازک ہے، دھرم کی دھار دونوں جانب یکساں ہے، سمجھ دار کا ایک طرح کی بالیدہ ناسمجھی ہے، اور جس شیش ناگ کے پھن پر دنیا سوار ہے وہ سانپوں میں سب سے زہریلا ہے، جس دن شیکھر جسم کو سات سوروپلی میں دھارن کرنے کے لئے بھات کباب کھا کر دھارمک ہونے کی ذمہ داری نباہتا ہوا کشمکش میں مبتلا تھا، اسی رات ادھر شہر کے منہ کا ذائقہ بگاڑنے کا ایک اور انتظام ہوا۔
ہوا یہ کہ ایک جوان ہندو لڑکی کا مردہ جسم مسلمانوں کے محلے میں، مدرسے کے پیچھے والے ٹیلے کے پاس، اتفاقاً

اس ہریجن کی زمین کے ٹکڑے پر پایا گیا۔ صبح "امروجوا" کی داد کی میدان جا رہی تھی کہ اس نے چلانا شروع کر دیا بات ہی بات میں لوگ باگ اٹھتے ہوئے سچ بات کیا تھی، اس کا راز بہت دنوں بعد فاش ہوا، لڑکی کا نام سمترا تھا، اور وہ میٹرک کا امتحان دینے گاؤں سے اپنے رشتہ دار کے ہاں آئی تھی۔ سمترا کا ناپختہ ذہن تھا، رشتے دار کی نظر اس پر پڑی، پھر ایک دن اسے جو موقع ملا تو مت پوچھیے پہلے تو سمترا بھونچکی رہی کہ کیا ہوا، وہ بے تحاشہ روئی، پھر غصے میں آکر اس نے کہا کہ اس کی سیاہ کاری کا بھانڈا پولس اور لوگوں کے سامنے پھوڑ دے گی، لیکن اس سے غلطی ہو گئی ہے، رشتے دار دراصل بہت ڈر گیا۔ ہندو لڑکی کی عصمت دریدہ لاش اور وہ بھی مسلمانوں کے محلے میں، پھر تو جیسا ہونا تھا ہوا، جیسا ہوتا ہے، قصے کہانیوں میں، جیسا بتایا جاتا ہے اخباروں کی سرخیوں میں، جنہیں پڑھنے کے لئے لوگ ان پر ردی کے ٹکڑوں پر بھوکے کتوں کی طرح جھپٹتے ہیں، کبھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، کبھی نہیں بھی ہوتے۔

خون اور مادہ تولید کی شناخت ہندو مسلمان کی شکل میں اب تک نہیں ہو پائی ہے، جانے ایٹم بم بنانے والے اور راکٹ چھوڑنے والے سائنس داں اس طرف کیوں کچھ حاصل نہیں کر پاتے، معمولی سا واقعہ ہے کوئی سیال سی شئے ایجاد کرنی ہے جسے ٹیسٹ ٹیوب میں رکھے خون یا مادہ تولید میں ملا دینا ہے، پھر ہندو کا معلوم ہو تو مسجد میں رکھنے پر اس میں ابال آجائے، مسلمان کا ہو تو مندر میں لے جانے میں ابل پڑے، بس، ایسا ہی کچھ، جس دن ایسا ہو جائے گا، شک و شبہ کی بنیاد پر مذہبوں کو مجرم بنانے کا کاروبار بند ہو جائے گا یا ہو سکتا ہے کہ پنڈت اور مولوی تب کوئی نیا طریقہ ایجاد کریں، بہر حال شک کی بنیاد پر مسلمانوں کو مجرم ٹھہرا دیا گیا۔ لوگوں نے ہون کیا، منتر پڑھے، اکچھت ڈالا، پرساد گرہن کیا، شہر کا رنگ بدل گیا، پہلے چھٹ پٹے سنگھرش ہوئے، پھر ایک آدھ بار جم کر لڑائی ہوئی، دو دنوں کے اندر جب چوبیس لوگوں کی جان چلی گئی تب انتظامیہ کو ہوش آیا، اس نے کرفیو لگا دیا، کرفیو میں بھی دن بھر شہر کے کسی نہ کسی کونے سے بم کے دھماکوں کی آواز آتی رہتی اور دل دہلاتی رہتی، اس سے زیادہ دل دہلاتے کسی کسی محلے سے چیخ کر لگائے گئے اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے نعرے۔ اللہ اور مہادیو کا نام سن کر گھروں میں عورتوں کا پیشاب خطا ہو جاتا۔

دھیرے دھیرے ماحول پرسکون ہوتا نظر آیا، کسی کو پتہ نہیں تھا کہ نفرت کا لاوا اندر ہی اندر گرم ہو کر کس قدر ناسور بن چکا تھا۔

پانچویں دن کرفیو میں ڈھیل دی گئی،

شام کا وقت تھا، کرفیو میں ڈھیل کی خبر لاؤڈ اسپیکر میں نشر ہونے کی دیر تھی کہ لوگ برساتی کیڑوں کی طرح

ادھر ادھر نکل پڑے شیکھر نے بھی سوچا کہ تھوڑا گھوم گھام لیا جائے۔ بس، نکل پڑا اسے کچھ خریدنا دریدنا تو تھا نہیں بس یوں ہی ٹہلتا ٹہلتا گجراتی موڑ کی طرح چل پڑا شیکھر کس خطرے میں تھا اس کو سمجھنے کے لئے گجراتی موڑ کا جغرافیہ جاننا تھوڑا ضروری ہے۔

یہ محلہ نصیب گنج چوراہے سے سٹا ہوا ہے، اور ہندوؤں کا گڑھ سا ہے زیادہ تر کاروباری قسم کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں اور سٹے مکانوں کی ایک بھول بھلیاں سا ہے یہ محلہ، کچھ گجراتی خاندان یہاں ضرور بستے ہیں اور ممکن ہے یہ محلہ ان ہی لوگوں نے آباد کیا ہو، لیکن یہاں پر ہر طبقے کے لوگ مل جائیں گے۔ ایک بڑے گھیرے کے اندر جس کا نام ہندر ہے ’سمترا‘ جس کی موت سے یہ کہانی وابستہ ہے، جیسے جڑ سے وابستہ ہے پھنگی کا پتہ، وہ بھی اس محلے میں رہ رہی تھی، غور طلب بات یہ ہے کہ اسی محلے میں مسلمانوں کے دو گھر ہیں، ایک ٹیلر ماسٹر کا گھر اور دوسرا قصائی کا، اس کے پیچھے ایک دلچسپ وجہ ہے۔ اب یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ہندو چاہے کتنا ہی کٹر کیوں نہ ہو مسلمان درزی سے سلواتا ہوا نہیں جھجکتا، نہ ہی وہ مسلمان قصائی سے ذبح کیا ہوا گوشت خریدتے وقت کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے، کئی ہندو اسے اپنا بڑا پن مانتے ہیں اور روا داری کی مثال کی صورت میں پیش کرتے ہیں، یہ تو ہوئی اپنی سمجھ، فائدہ مند اور آسانی کی بات۔ یہی ہندو دنگے کے وقت اس درزی اور اس قصائی پر قہر نازل کرتا ہوا شرمندہ نہیں ہوتا، جب قینچی، ذبح اور ختنے میں انتخاب کرنا ہو تو ختنے کا ثواب سب سے اہم ہو جاتا ہے۔

گجراتی موڑ سے کوئی گذرے تو اس بات کی سچائی اسے صاف نظر آسکتی ہے،

کچھ باتیں پاک دامن عورتیں ہوتی ہیں تو کچھ باتیں بد چلن، اس بات کا کردار ایک طوائف کے کردار کی طرح سچا، آمنے سامنے، ننگا اور بکھرا ہوا ہے۔

آج گجراتی موڑ پر کریم قصاب اور افضل ٹیلر کی دکانیں نہیں ہیں۔ وہاں دو ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے ملبے ہیں جو اس دنگے کی کہانی سناتے ہیں، اس دن بہت سارے لوگ ملبے کے نزدیک کھڑے تھے، کچھ لوگ غمگین تو کچھ لوگ غصے میں چور تھے، غمگین لوگ ان مکھیوں کی طرح جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر سڑے آم کے چھلکے پر بیٹھی فلسفیانہ انداز میں آسمان کی سادگی پر غور و فکر سے کام لیتی ہیں۔

غصے میں چور لوگ ان چھپکلیوں کی طرح جن کے منہ میں پھنس کر بھی کوئی بھدا سا بدبودار کیڑا نکل بھاگا ہو اور ادھر ادھر دیواروں سے ٹکراتا اڑتا پھرتا ہو۔

لوگ طرح طرح کے قیاس کر رہے تھے، کسی کا قیاس تھا کہ مسلمانوں نے پچاس ہندوؤں کو مار ڈالا تھا اور کوئی اس سے بھی زیادہ تعداد بتا رہا تھا اور کوئی کم،

ایسا لگ رہا تھا جیسے ہوا میں بجلی کی لہر دوڑ رہی ہو، ایک ایک کر کے لوگوں کو چھوتی اور نیگیٹیو بناتی، اچانک کہیں نزدیک زوردار دھماکہ ہوا، سارے بازار میں کھلبلی مچ گئی، لوگ منتشر ہوتے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگے، شیکھر بھی گھبرا کر تیزی سے بھاگنے کو تیار ہوا تو پھر ایک اور دھماکہ ہوا اچانک اس کے کان کے پردے سُن ہو کر رہ گئے، اسے ایسا لگا جیسے کوئی بم اس کے ماتھے پر آ گرا ہو اور وہ بری طرح زخمی ہو گیا ہو، پھر اسے لگا کہ جدھر وہ دوڑ رہا ہے اُدھر ہی دھماکہ ہوا ہے یا ہونے والا ہے۔

شیکھر پلٹ کر بھاگا اور بھول بھلیاں جیسی گلی میں بھاگتا چلا گیا، سارے لوگ بھاگ رہے تھے، اچانک دور کہیں پولس کے سائرن کی چیخ اٹھی، شیکھر کو لگا جیسے وہ چھوٹا سا چوزہ ہو اور اوپر آسمان میں ایک چیل چیختی ہوئی اپنے پنجے میں اسے دبوچنا چاہتی ہو، ایک چوزے کی طرح سمتوں کا ہوش کھو کر بدسمتی کا شکار ہو کر وہ بھاگا کہ سامنے ایک گلی آئی تو اس میں سماتا چلا گیا۔ گلی کے دہانے پر آیا تو سامنے نصیب گنج کا چوراہا تھا اس کے ہوش اڑ گئے۔

جیسے بھاگتے چوزے کے سر پر چیل منڈلا رہا ہو جس کی پرچھائیں میں آ کر وہ ٹھٹھک کر آخر رک گیا ہو، اس کے نزدیک شیر کھڑا گھور رہا ہو پنجے دابے یہ وہی نصیب گنج چوراہا تھا، غریبوں کو سستی خوراک دینے والا لیکن کتنا خوفناک، آج شیکھر مسلمان بن کر بھات اور کباب کھانے کے لئے نہیں بلکہ دنگے کی ہانک پر بھاگتے ہوئے ہندو کے روپ میں آیا تھا۔ سامنے رمضانی کا ڈھابا نظر آ رہا تھا لیکن آس پاس کا ماحول دہشت زدہ اور ڈراؤنا لگ رہا تھا۔

چوراہے پر بہت سارے لوگ تھے، سبھی مسلمان لگ رہے تھے۔ سبھی کے چہرے گمبھیر تھے یہاں بھی وہی فلسفہ زدہ مکھیوں اور بوکھلائی ہوئی چھپکلیوں کی طرح کے لوگ تھے۔

شیکھر جب دوڑتا ہوا گلی کے دہانے پر آیا تو لگ بھگ سارے لوگوں کی نظر اس پر پڑی۔ وہ یک دم جامد ہو گیا۔

نہ جانے اسے اس وقت کیا ہو گیا، اسے ایسا لگا کہ جیسے اب جان کی خیر نہیں ہے، جی میں آیا کہ وہ بھاگ جائے، پرندے کی طرح اڑ جائے، جن کی طرح دھوئیں میں تحلیل ہو جائے، مگر اس کے پاؤں کو جیسے لقوا مار گیا، تب تک دیر بھی ہو چکی تھی۔

چار پانچ لوگ ہی تھے، ان میں سے ایک نے اطمینان سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیوں میاں"، کہاں سے بھاگ کر آئے ہو، ہندوؤں کے محلوں کی طرف سے؟ وہاں پھر کوئی ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے کیا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ اگر اس آدمی نے ہاتھ اس کے کاندھے پر نہیں رکھا ہوتا تو شاید وہ کچھ بول پاتا، کاندھے

پر رکھے ایک مسلمان ہاتھ نے شیکھر کی ساری طاقت کھینچ لی تھی۔ جیسے" سیاہی چوس" سیاہی کو چوس لیتا ہے، کیوں صاحب بول کیوں نہیں رہے ہیں، یہ زور دار دھماکے کیسے ہوئے تھے؟
کون ہیں آپ؟
"یہ چھوکرا مجھے مسلمان نہیں لگتا۔
کیوں بے بولتا کیوں نہیں؟
لنگی میں ملبوس ایک بھاری بھرکم آواز والے نے کہا۔
وہ بولنا چاہتا تھا مگر اس کا گلا سوکھا جا رہا تھا۔ یہ سن کر کوئی ہندو ہے، بھیڑ اور قریب جم گئی۔ عجیب نظارا تھا۔ لوگ اسے شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، شک ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا، جیسے کوئی تندوا پہاڑ پر چڑھ رہا ہو دھیرے دھیرے ___ لیکن یقینی طور سے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کب کیا ہوگا۔
میاں تم کون ہو، کہتے کیوں نہیں گونگے ہو کیا؟
معاملہ بگڑتا ہی جا رہا تھا، اس نے بولنے کی کوشش کی، مگر حلق سے ہلکی سی ممیاہٹ نکل پائی، دراصل اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کی جان چلی جائے گی۔
اس نے دنگے کے بارے میں سوچا تھا اس نے سوچا تھا کہ کبھی دنگے کی زد میں آیا تو ایسا کرے گا ویسا کریگا ایسا بولے گا اور ویسا بولے گا، آواز میں بلندی، چہرے پر سنجیدگی رہے گی مگر وقت پڑا تو اسے کچھ یاد نہیں رہا۔
یہ ایسے نہیں بولے گا۔ سالے کا ازار بند کھولو سب پتہ چل جائے گا وہی بھاری بھرکم لنگی والے کی آواز اُبھری، ایسے وقت گھبراہٹ میں اس کا پاجامہ تھوڑا گیلا ہو گیا۔
ہے بھگون ...... اس نے سوچا .... ہے بھگون یہ تو سعادت حسین بول رہا ہے۔ وہ میری جان لے لیگا۔
کچھ چیزیں چرائے بنا چرائی جا سکتی ہیں شیکھر نہیں جانتا تھا کہ سبھی لوگ منٹو کی حیثیت سے واقف نہیں، پھر بھی ازار بند کھول سکتے ہیں۔
اگر ہندو ہوا تو سالے کی گردن مار دوں گا۔ یا علی کافروں نے جتنے مسلمانوں کو مارا ہے اتنے ہندوؤں کے خون سے اس کہانی کی تکمیل ہوگی ایک کرخت آواز گونجی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ بھیڑ میں کچھ لوگوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا، شیکھر لگ بھگ بے ہوش ہو چکا تھا کہ اچانک اسے رمضانی نظر آیا۔

رمضانی یہ کوئی نام سا نام ہے۔
رمضانی
اس کے منہ سے پہلا صاف لفظ نکلا، کیا رمضانی اللہ کے نام سے پرتاثیر نام ہے۔ اگر شیکھر ایک لاکھ بار بھی اللہ بولتا یا ایک کروڑ بار محمد کا نام لیتا تو وہ بچ جاتا؟ مگر اس نے تو ایک معمولی ڈھابے والے کا نام اس سنکٹ کے سمئے میں لیا،
رمضانی شاید اس وقت بھیڑ میں شامل ہوا تھا، دیر سے سہی، مگر شاتماشہ دیکھنے یا شاید حصہ بانٹنے۔ مگر نہیں، رمضانی ان لوگوں میں نہیں۔
ارے میاں یہ آپ ہیں انور بھائی، کیا حالت بنا رکھی ہے، رمضانی نے قریب آکر شکیھر کا ہاتھ تھام کر کہا، رمضانی کی ہتھیلی ایسی تھی جیسے گلاب کی تازہ کلی یا کوئی قل قل سی ندی۔
اماں سلن تمہارے جیسا بدتمیز آدمی میں نے نہیں دیکھا یہ تو اپنے انور میاں ہیں اور یہیں ڈھابے میں آکر بھات اور کباب کھاتے ہیں۔ پھر تمہیں سوچنا چاہئے کہ ان کے محلے سے ہماری طرف بھاگ کر ان میں سے کوئی کیوں آئے گا۔
دوسرے اللہ کے کسی بندے پر ہاتھ اٹھانے اور اس کی بے عزتی کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں، کافروں کو اگر اللہ نے بنایا ہے تو وہی انہیں دوزخ میں دیکھے گا۔ ہم کیوں اپنے آپ کو خدا سمجھیں۔
کالا تیندوا پہاڑ پر چڑھتا چڑھتا اچانک جیسے کسی چٹکار سے پھسل کر نیچے کھائی میں جا گرا تھا۔
ایک دن رمضانی کی تفتیش پر شیکھر نے اپنا نام گڑھ کر انور بتا دیا تھا، تب کون جانتا تھا۔
سلن نے جو گنوار اور نرا جاہل تھا فتویٰ صادر کیا رمضانی تم کفر بولنے سے باز آؤ۔ خود محمد نے کافروں کو موت کی سزا دی تھی۔
حضرت محمدؐ کی بابت کچھ نہیں جانتا وہ تو تمام تر دنیاؤں کی رحمت ہیں۔
رمضانی گمبھیرتا سے بولا
ایک پل کے لئے لگا جیسے تیندوا کھائی سے باہر آنے والا ہے، لیکن سلن کا مزاج اب اتار پر تھا، سلن جیسے لوگ ایک جھٹکے میں کچھ بھی کر سکتے ہیں، لیکن زیادہ دیر تک بحث بھی نہیں کر سکتے۔
چلو میاں ڈھابے پر بیٹھ کر ایک ایک کپ چائے پیتے ہیں، پھر تم بتانا ادھر سے بھاگ کر کیوں آرہے تھے؟ اس نے کہا

شیکھر رمضانی اور سلن کے ساتھ چل پڑا اب تک وہ کافی سنبھل چکا تھا۔ اسے لگا کہ چلو مصیبت ٹل چکی ہے، یہ اتفاق ہی کی بات تھی کہ
ایک اپوتر بھوجن کے نام پر آج اس کی جان بچ گئی تھی۔ مگر اپنے دو بہی خواہوں کو جھانسا دینا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اس کی خود اعتمادی واپس آنے لگی تھی۔ جہاں کالے رنگ کا چیتا چڑھ رہا تھا انہیں چٹانوں پر لگا کہ جیسے ایک سفید خرگوش پھدک رہا ہو، جھانسا دینا کوئی مشکل کام تو نہیں، اس نے دل ہی دل میں سوچا۔۔۔۔۔۔
جھانسا دینے کا کام بھی بخوبی انجام پایا، اور یہ رمضانی ہی تھا کہ جس نے خود کو اور سلن کو جھانسا دلانے میں اہم رول ادا کیا۔ نہ جانے کہاں سے اس نے شیکھر کے لئے ایک پورا کنبہ ایجاد کیا کہ جو اس کے لئے ایک چمتکار والی بات تھی، شاید رمضانی اسے کسی اور شخص کے ساتھ کنفیوز کر رہا تھا۔
شیکھر کو صرف اتنا کہنا پڑا کہ وہ افضل ٹیلر کی کھوج خبر لینے گجراتی محلے گیا تھا۔ جہاں بم دھماکے سے وہ اتنا ڈر گیا کہ نصیب گنج کی طرف بے اختیار بھاگ کر چلا آیا جب تک سلن موجود رہا رمضانی یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا مگر جیسے ہی وہ اوجھل ہوا کہ اس نے اسے کوسنا شروع کر دیا، اس نے شیکھر کو بتایا کہ یہ کباب کھانے والی بات ہی تھی کہ جس کی وجہ سے سلن اور دوسرے لوگوں نے اس کا پاجامہ نہیں اتروایا تھا۔
وہ بغیر ختنہ دیکھے نہیں مانتے
ویسے اس میں شک نہیں کہ تم ایک خالص مسلمان ہو، مگر سوچو تو، بیچ بازار میں ننگا کیا جانا تمہاری کیا درگت ہوتی، پھر جو رمضانی شروع ہوا تو اس کی زبان سے ایک اور خطرناک بات نکل پڑی۔
نصیب گنج چوراہے کے پاس ہندوؤں کے پانچ گھر ہیں، ان میں سے دو گھروں کے لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئے تھے مگر تین گھروں میں ابھی لوگ تھے، کچھ مرد کچھ عورتیں اور کچھ بچے۔
سلن اور کچھ لوگ ان مکانوں پر حملہ کرنے کا پلان بنا رہے تھے، ہو سکتا ہے، آج رات ہی،
رمضانی بولا، لگتا ہے جیسے سبھی وحشی اور درندے ہو گئے ہیں۔ یہ ظالم نہیں سمجھ رہے ہیں کہ دوسرے فرقے کے لوگوں کو مار کر یہ اپنے فرقے کے لوگوں کی موت کے کارن بن رہے ہیں۔
تھوڑی دیر رمضانی یوں ہی بڑبڑاتا رہا، پھر قبیقن کے لہجے میں کہا کہ اگر ہو سکا تو وہ جان پر کھیل کر بھی ہندوؤں کو بچائے گا۔
انور میاں، تمہارے ساتھ آج کی زیادتی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں، وہ بولا۔
شیکھر نے رمضانی کی بات کی تائید کی اور اس کا ساتھ دینے کی بات کہی اتنا سن کر رمضانی کی آنکھ بھر

آئی۔ تم خدا کے نیک بندے ہو انور میاں۔ دیکھ لینا تمہیں اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں، تقریباً یہی حال شیکھر کا بھی تھا۔

اسی رات، خوف اور دہشت کے اس ماحول میں رمضانی کے ساتھ مل کر شیکھر نے ایک نیک کام کو انجام دیا،

ہندو گھروں کے لوگوں کو بروقت اطلاع دی اور محفوظ مقام تک پہنچنے میں ان کی مدد کی۔ شیکھر کے لئے دراصل وہ دن ایک عبرت کا دن تھا۔

خوف اور سناٹوں کے کئی مرحلوں سے وہ گزرا، اس نے محسوس کیا کہ بغیر اپنا دھرم چھوڑے اور توڑے بھی کوئی دھارمک رہ سکتا ہے، اور دھرم کو چھوڑ کر اور توڑ کر بھی دھارمک ہوا جا سکتا ہے۔

اس دن تو شیکھر رمضانی سے اجازت لے کر چلا آیا لیکن بہت دنوں تک اسے ایک بات کچوکے لگاتی رہی کہ اس نے رمضانی جیسے معصوم شخص کو دھوکے میں رکھا، اس کا ضمیر ہر لمحہ اسے کہہ رہا تھا کہ رمضانی کو حقیقت سے روشناس کر دینا چاہئے تھا، لگ بھگ دو مہینے تک وہ اس بات سے پریشان رہا، پھر غیر ارادی طور پر اک دن وہ رمضانی سے ملنے چلا گیا، علی الصبح

سچ بولنے اور سچ سننے کا وہی سب سے مناسب وقت تھا۔

رمضانی ڈھابے کے قریب ایک ٹوٹی کرسی پر بیٹھا تھا شیکھر کا اس نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔

اسے کرسی پر بیٹھایا اندر سے اپنے لئے اسٹول اور شیکھر کیسے چائے لیتا آیا۔

پھر رمضانی نے شیکھر کی خیریت دریافت کی۔ اس نے شیکھر کو بتایا کہ کیسے لوگوں نے اسی رات ہندوؤں کے ان پانچ گھروں پر دھاوا بولا تھا۔ کیسے پولیس کی گولی سے دو بلوائی مارے گئے تھے۔ پہلے تو شیکھر کو بہت جھجک ہوتی رہی لیکن پھر رمضانی پر اس نے اپنا بھید کھول دیا۔

رمضانی چپ ہو گیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا شیکھر نے سوچا کہ وہ ناراض ہو گیا ہے، مگر جب اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

خدا جانتا ہے شیکھر بھائی کہ میں نے اس دن صرف مسلمان مان کر تمہیں نہیں بچایا تھا، تم نیک آدمی ہو اور اسلام نیک لوگوں کا مذہب ہے۔ جیسے ہندو دھرم بھلے مانوسوں کا میرے لئے تم مسلمان رہو گے چاہے کچھ کھاؤ، کچھ پہنو، کچھ اوڑھو۔

ٹھیک ــــــــــــ بالکل ٹھیک۔ (اردو ترجمہ: رونق نعیم)

●●

ثقافت

انگریزی سے ترجمہ
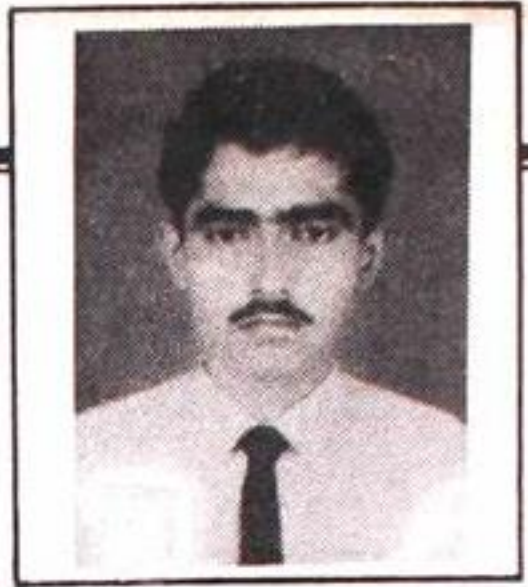
ہندوستان کی عصری لوک اور قبائلی مصوری

فاروق فیصل

Depening & Depening
10, government Place (East)
Calcutta - (West Bengal)

ہندوستان کی لوک اور قبائلی مصوری " فنِ صغیر" یعنی (معمولی اشیاء کی تصویر کشی) کی کلاسیکی روایات سے امتیازی خصوصیت کا واضح اظہار کرتی ہے۔ اپنے فارم کی پائیداری، ہم آہنگی اور سچائی میں یہ لوک اور قبائلی فن ایک ایسے نظریۂ حیات کا مظہر ہے جو فطرت (Nature) سے بالکل قریب ہے۔
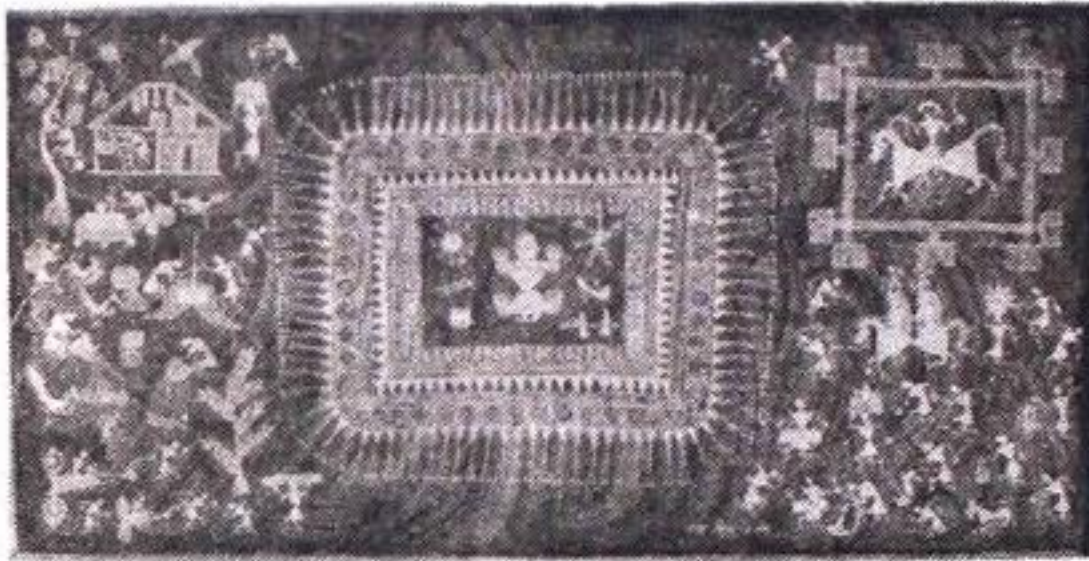
قبائلی مصوروں کا جبلّی ادراک اور قدرتی مناظر کی طرف ان کی طبیعت کا میلان ان کے فن کے بنیادی تانے بانے ہیں۔ جو اس بے ساختہ اور آفاقی جذبے کو ممیّز کرتے ہیں جس کے اظہار کا وسیلہ فنکار ہوتا ہے۔ فطرت سے ان کی محبت اس فن کی متنوع صورتوں یعنی " بھتّی چتر" (دیواری نقوش)، " پاتا چتر" (کپڑے یا کاغذ پر بنائی گئی تصویریں) یا پھر فرش پر بنائی جانے والی تزئینی تصویریں " دھولی چتر" میں جھلکتی ہے۔

لوک اور قبائلی مصوری دراصل دیہی ہندوستان کی ایجاد ہے۔ اسے جاگیردارانہ تانا شاہی کی سرپرستی حاصل نہیں تھی لہٰذا بیشتر لوک فنکار مفلوک الحالی ہی میں اپنے فن کو جلا بخشتے۔ ان کی زندگی خانہ بدوشانہ ہوتی۔ وہ مختلف بازاروں، اتوار کے دن لگنے والے میلوں، اور اس فن کے لئے کشش رکھنے والے سامعین کی جستجو میں اپنی مصورانہ کاوشوں

کے موضوعات سے متعلق نغمے گاتے گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے، جس کے صلے میں سامعین اپنے وسائل کے مطابق رقم، سبزی یا چاول ان کے کشکول میں ڈال دیتے۔ اس طرح اس فن نے قدیم سمعی وبصری فن کی شکل اختیار کرلی۔ ہزار سالہ قدیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے یہ تصویریں افادی ومذہبی مقاصد کے حصول کی خاطر ہی بنائی جاتی رہیں۔ ان تصویروں میں ہندوستانی رزمیہ نظموں، رامائن، مہابھارت پر مبنی مذہبی اور ہندستانی دیومالائی موضوعات کی عکاسی کی گئی ہے گہرے رنگوں کی آمیزش سے خلق کی گئیں یہ تصویریں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

لوک اور قبائلی فن کے درمیان امتیازات محدود ہیں اور لبا اوقات یہ محدود افتراق بھی محو ہو جاتے ہیں بہرکیف لکیروں اور رنگوں کے استعمال ہی ان امتیازات کے عمومی علائم ہیں۔

ہندستان میں موجود مہاراشٹر کی ورلیز (Warlis) اور اڑیسہ کی سوریاز (Souryas) قبائلی مصوری دراصل "نقش بر دیوار" یا "بھتی چتر" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ ان کی ساختیاتی خصوصیت بہت طاقتور ہوتی ہے۔ یہ تصویریں اوقیانوسی اور قدیم افریقی فن سے مشابہ ایک ایسے احساس کا اظہار کرتی ہیں جس نے یورپ کی جدید مصوّری کے ارتقا میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہندوستان کی بیشتر روایتی لوک تصویریں اسکرول (صفحۂ قرطاس) پر ہی بنائی جاتی ہیں اور ہر تصویر کے چوکھٹے کو اس غرض سے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کردیا جاتا ہے کہ وہ باہم مل جل کر ایک طویل کہانی کی شکل اختیار کرلیں۔ اس نوع کی تصاویر میں استعمال کئے جانے والے بیشتر رنگ سبزیوں کے عرق یا ان کی باقیات سے تیار کئے جاتے ہیں لیکن اس ضمن میں چند مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں معاصر رنگوں کا استعمال بھی کیا جارہا ہے تاکہ تصویریں جاذب نظر ہوسکیں۔ ان تصاویر میں آبی رنگوں کا استعمال (Arabic) گوند کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (بہ ایں ہمہ پکا پلستری رنگ ہی ان کا مخصوص ذریعۂ ترسیل ہے)۔

مہاراشٹر کی ورلی قبائلی مصوّری

ورلی تصویریں گہرے رنگوں کے ایسے کاغذ پر سفید رنگ سے بنائی جاتی ہیں جن پر گائے کے گوبر کی باریک تہہ چڑھی ہوتی ہے۔ نیم تخیلی لکیروں پر مشتمل خاکے کینوس کی سطح پر ایک آسان بیانیہ کی طرح رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ ورلی نقاشی کچی دیواروں والی جھونپڑیوں پر فرد رسم و رواج سے متعلق بنائی گئیں تصویروں سے پیدا ہوئی اور ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی لوک کہانیوں، مزاح اور دیو مالا پر مبنی ایک تصویری ذخیرے کی شکل اختیار کر گئی۔ بصری اعتبار سے یہ چونکا دینے والی تصویریں ہیں کیوں کہ ان میں رنگ کا سہارا نہیں لیا جاتا اور تفصیلات سے واضح طور پر گریز کیا جاتا ہے۔ ورلی کی مصطلحات اپنے اندر تقریباً تصویری خط کا سا اثر رکھتی ہیں۔

بنگال کی لوک مصوّری (پاتا چتر)

آرٹ پیپر پر تخلیق کی جانے والی بنگال کے لوک مصوّروں کی تصویریں خصوصاً مغربی بنگال کے ضلع مرشد آباد، بیر بھوم، بانکوڑہ، ہگلی، بردوان اور مدنا پور میں جنمی کہانیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جب کہ ان کے موضوعات رامائن، مہابھارت اور دیگر دیو مالائی مہمات کی تمثیل پیش کرتے ہیں۔

سنتھال کی پاٹ مصوّری

سنتھال کی پاٹ تصویریں ہندوؤں کی ایک مخصوص ذات جادو پٹوا (میجک مصوّر) ہی خاص طور پر سنتھالی ناظرین کے تفننِ طبع کے لئے تیار کرتی ہے۔ جادو پٹوا ایک ایسے چھوٹے معاشرے کے فرد ہیں جو سماجی حیثیت سے کمہاروں، حجاموں اور لوہاروں سے بہت حد تک مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ بہار کے خطّہ سنتھال پرگنہ اور بنگال سے متصل علاقوں تک محدود ہیں۔ ان اسکرول پینٹنگز کے موضوعات کو سات مختلف خانوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(۱) زندگی موت کی حکمرانی میں

(۲) سنتھالی روایتوں کے مطابق سنتھالیوں کے وجود کی کہانی

(۳) باپا کا سنتھالی میلا

(۴) سنتھالی رقص کے لئے منعقدہ عوامی اجتماعات اور جاترائیں

(۵) ایک آدمی اکثر ایک شیر یا چیتے کی پشت پر سوار

(۶) سنتھالی طبقوں کی تجسیم

(۷) گوالنوں کے ساتھ کرشن کے تماشے

اڑیسہ کی لوک مصوری (پاتا چتر) اڑیسہ میں اس طرز کی تصویریں خاص طور پر کپڑے یا کاغذ پر بنائی جاتی ہیں۔ ان پر لبا اوقات، پہلے گوبر ملی کالی مٹی کا لیپ لگایا جاتا ہے اور خشک ہو جانے کے بعد ان پر لاکھ کی ایک تہہ جما دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کاغذ یا کپڑے میں مسام داری ختم ہو کر سختی آجاتی ہے۔ پھر اس تیار شدہ سطح پر رنگوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ان مصوروں کا پسندیدہ موضوع بھگوان جگن ناتھ ہیں جنہیں کائنات کا مالک تسلیم کیا جاتا ہے حالانکہ گذشتہ چند برسوں کے دوران نگاہوں کو خیرہ کرنے والے کلینڈروں کی طباعت سے مصوروں کا یہ موضوع ایک حد تک خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس کے باوجود آزادی کے بعد Cottage Industries Board کی مداخلت کے ساتھ ساتھ آج بھی یہ مصور اپنی تخلیقی سرگرمیاں اور کاوشیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان موضوعات میں تھوڑی بہت وسعت ضروری آئی ہے لیکن ان کا روایتی اسلوب بدستور باقی ہے۔

بہار کی مدھوبنی مصوری مدھوبنی مصوری "بھتی چتر" یا نقش بر دیوار کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس میں کسی بچے کے سن بلوغ کو پہنچنے پر رسم زناری، خاندانی معابد کی تجدید کاری، چھٹ اور چوتھ چاند کے تہواروں، دیوی تھن اکادسی، پہلی شادی یا بچپن کی شادی جیسے خاص موقعوں پر درو دیوار کو فن نقاشی سے مزین کیا جاتا ہے۔ مدھوبنی مصوروں کے تین مختلف فرقے کائستھ، برہمن اور شدر اب تک اس فن کی مشاغل کر رہے ہیں۔ ان کی تصویروں کے انداز اور اسلوب ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔ ان تصویروں میں رنگ نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ مدھوبنی برہمن مصوری کے شوخ نیلے، زرد، گلابی اور سرخ انفرادی رنگ "میتھلی کائستھ مصوری" میں آمیزے کی شکل میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان مصوروں کے ہنر کا کمال لکیروں کے استعمال سے ظاہر ہے شدر فرقے کے مصوروں میں زیادہ تر سفید اور سیاہ رنگ ہی مستعمل ہیں۔ برہمن اور کائستھ فرقے میں عورتیں گھریلو اشیا کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ یہ تصویر کشی مختلف صورتیں اختیار کر جاتی ہے اور نیچر سے لے کر روزمرہ کی زندگی تک کا احاطہ کرتی ہے۔ "بھتی چتر" کی روایت کی بقا کے پیش نظر کاغذ کی سطح پر گوبر کی ایک ہلکی سی پرت چڑھا دی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے استعمال کئے جانے والے رنگ سبزیوں سے تیار کئے جاتے ہیں اور آج کل وقت کی بچت کے لئے جدید قسم کے لوازم بھی استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔

مہاراشٹر، جنوبی کرناٹک اور آندھرا پردیش کی 'چتر کاتھی' مصوری

جنوبی ہند کے روایتی لوک مصور، ناظرین کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے گاؤں گاؤں سفر کرتے ہیں۔ ان کی مصوری کاغذ پر افقی انداز میں رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں کی تمثیل پیش کرتی ہے۔ آج کل ایسے لوک مصوروں کی تعداد نہایت قلیل ہے جو اس فن میں اپنی مشق جاری رکھے ہوئے ہیں اور سبزیوں سے تیار کئے ہوئے رنگ اور کپڑے یا کاغذ استعمال کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب دوسری ریاستوں کے لوک مصوروں سے الگ ہے۔ ان میں اعلیٰ جمالیاتی خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ (اردو ترجمہ: فہیم انور)

تبصرے

مبصر:
مظفر حنفی
P-1/7, C.I.T. Scheme VII-M
Calcutta- 54

مشفق خواجہ نے کہیں کہا ہے کہ وزیر آغا ان لکھنے والوں میں سے ہیں جو اپنے عہد کی شناخت بن جاتے ہیں۔ ان کا زرخیز قلم گذشتہ چالیس برسوں سے گلشنِ ادب میں اپنی تخلیقی توانائی اور خلاّقی سے گل کاریوں میں مصروف ہے اور ان کی قلم رو میں اقلیم سخن کے تقریباً تمام ابعاد و جہات شامل ہیں۔ نظم، غزل، منظوم آپ بیتی، تنقید، مکتوبات، انشائیہ، سفرنامہ، تحقیق، ترتیب و تدوین، جریدہ نگاری، فکاہیہ اور متعدد دیگر اصنافِ ادب میں وزیر آغا نے اپنے تخلیقی سفر کے نقشِ پا ثبت کیے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ وزیر آغا سے میرا ادبی تعارف ان کی شاعری، تنقید، انشائیہ، وغیرہ کے وسیلے سے نہیں ہوا بلکہ موصوف کی

سب سے پہلی نگارشِ قلم، جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا "آشوبِ آگہی" کے عنوان سے مضامین کا وہ سلسلہ تھا جس کی ایک آدھ قسط غالباً مولانا صلاح الدین احمد کے مؤقر رسالے "ادبی دنیا" (لاہور) میں شائع کی گئی تھی جب اس رسالے کے حصۂ نظم کے مدیر وزیر آغا ہوا کرتے تھے مولانا موصوف کی رحلت کے بعد وزیر آغا نے ان کی یاد میں "اوراق" جاری کیا تو اس میں بھی "آشوبِ آگہی" کی کچھ اقساط چھپیں یہ غالباً بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تھی۔ بعد کی رُبع صدی نے وزیر آغا کو نقاد، انشائیہ نگار، شاعر اور مدیر کی حیثیت سے اتنا مشہور کیا کہ "آشوبِ آگہی" والا وزیر آغا اس غبار میں چھپ گیا لیکن میں نے ان کی کم و بیش تمام ہی نثری اور شعری نگارشات میں اسی وزیر آغا کی جھلکیاں دیکھیں جو "آشوبِ آگہی" کا مصنف تھا!

۱۹۸۸ء میں وزیر آغا، غالب سیمینار میں شرکت کے لئے دہلی تشریف لائے تو میں نے ماہنامہ "بیسویں صدی" میں اشاعت کے لئے مختلف ادبی موضوعات پر ان کے ساتھ دیر تک باتیں کیں اور ان کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو کھنگالا۔ اس طویل مکالمے کے دوران مجھے احساس ہوا کہ دراصل ہماری کائنات وزیر آغا کے لئے ابتدا ہی سے پراسرار سوالیہ نشان رہی ہے اور انہوں نے اپنی غزلوں، نظموں، انشائیوں، تنقیدی تحریروں حتیٰ کہ خود نوشت سوانح عمریوں (شعری و نثری) کے ذریعہ کائنات کے اس بھید بھرے بستے کو کھولنے کی کوشش کی ہے وہ جب اپنی تحریروں میں خود کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو کائنات کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے ساری کائنات کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور یہ عمل دو طرفہ ہوتا ہے یعنی اس طرح خود کائنات بھی ان کے توسط سے اپنا نظارہ کر رہی ہوتی ہے۔ میری محوّلہ بالا گفتگو کے دوران یہ سوال ابھرا تھا کہ بنیادی طور پر وزیر آغا ادب کی کس صنف کے آدمی ہیں اور جواباً انہوں نے کہا تھا :-

"ہمارے یہاں ایک رویہ ہمیشہ سے رہا ہے کہ لکھنے والے کا تشخص اس ایک ٹھپّہ سے ہو جو اس کے ماتھے پر لگا دیا جائے مثلاً اسے نقّاد قرار دے دیا جائے۔ شاعری یا انشائیہ نگاری کے خانے میں ڈال دیا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی ادیب کو جب آپ دیکھیں تو اسے ٹکڑوں میں بانٹ کر نہ دیکھیں بلکہ مجموعی طور پر دیکھیں کہ وہ کیا ہے؟ جس طرح تخلیق کار کی سائکی کی مختلف سطحیں ہیں اسی طرح اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات بھی تہ در تہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو پوری طرح متعارف نہیں کرا سکتے۔ اس لئے بھی کہ ہر ایک صنف کا ایک اپنا مزاج ہے جس کے مطابق ہی وہ زندگی اور کائنات کی کسی ایک سطح تک رسائی پاتی ہے۔ لہٰذا ادیب جب تک پورے کا پورا (مختلف اصناف سے مسلح ہو کر) سامنے نہیں

آئے گا۔ عکس در عکس کا وہ سلسلہ جنم نہ لے سکے گا جو دو آئینوں کے ایک دوسرے کے روبرو آنے سے وجود میں آتا ہے"۔

اس ضمن میں وزیر آغا کی نظم "دستک" کے ابتدائی چند مصرعے بھی ملاحظہ فرمالیں۔

" یہ دستک سی کیا ہے ؟؟
ہر اک لمحہ ..... دستک
یہ دن رات اور ماہ و سال اور صدیاں
سبھی دستکیں
میرے سینے کی دھڑکن بھی دستک"

اسی طرح موصوف کی ایک اور نظم "نشر گاہ" بھی میرے اس خیال کو تقویت پہنچاتی ہے کہ وزیر آغا اس پوری کائنات کو انسان کے باطن پر دستک کے مترادف سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی نئی کتاب " دستک اس دروازے پر" کے مطالعہ سے میرے علم میں جو اضافہ ہوا سو ہوا، ایک خاص نوع کی طمانیت اور مسرّت بھی حاصل ہوئی جیسے دیر تک انتظار کرنے کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آگیا ہو بہت سی نثری تصنیفات کی اشاعت اور اپنی شاعری کا کلّیات ادبی دنیا کو نذر کرنے کے بعد اس کتاب کا منظر عام پر لانا ہی ثابت کرتا ہے کہ یہ ڈاکٹر موصوف کا " شاہ بیت " ہے دراصل اپنی اس کتاب میں وزیر آغا نے فکر کے سلسلے کو زیادہ تخلیق کاری، جامعیّت اور فن کارانہ بُنت کے ساتھ مکمل کیاہے۔ گہری باتوں اور پیچیدہ مسئلوں کو دلچسپ اور برجستہ بنانے کے لئے 'میں' اور 'تو' کے مابین بے تکلف مکالمہ کی تکنیک اختیار کی گئی ہے ابواب کی تقسیم" پہلا دن" سے لیکر" نواں دن" تک اس التزام سے کی گئی ہے کہ ہر دن کا آغاز وزیر آغا کی کسی نہ کسی ایسی نظم سے ہوتا ہے جو ذات اور کائنات کے درمیان پُل بناتاہے۔ یہاں پھر میرے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ وزیر آغا کی تمام نثری اور شعری نگارشات سوچ کے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ زیر تبصرہ کتاب میں شامل تمام نظمیں ان کے کسی ایک شعری مجموعہ سے منتخب نہیں کی گئیں بلکہ مختلف مجموعوں میں بکھری ہوئی تھیں اور اب ان نو ابواب میں اس طرح سج گئی ہیں جیسے مولانا ابو الکلام آزاد کی نثر میں مختلف شاعروں کے اشعار تحریر کے ساتھ جسم و جان کی طرح چسپاں ہو جاتے تھے ! " دستک اس دروازے پر" اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ بلاشبہ وزیر آغا خوبصورت نثر لکھتے ہیں اور واضح سوچ رکھتے ہیں۔ انہیں گداز دل اور جاگتا ذہن ودیعت ہوا ہے چنانچہ ان تمام حربوں سے آراستہ ہو کر جب وہ باطن کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتے ہیں تو نادر نکات تابناک موتیوں کی طرح ان کے ہاتھ آتے ہیں اور بیکراں کائنات کے سفر سے حقائق کے انتہائی تابناک ستارے توڑ لاتے ہیں پھر انہیں ان

کی خلاقی اپنی تحریریں اس خوبصورتی سے پرو دیتی ہے کہ پڑھنے والے کی ذات بھی اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی بیکراں کائنات کی دستک اپنے دل پر محسوس کرنے لگتی ہے۔

خواہ وزیر آغا کو شعوری طور پر اس کا احساس نہ ہو لیکن ان کی فکر و احساس نے اس کتاب کے مواد کو اندر ہی اندر پچیس۲۵ برسوں سے زیادہ مدت تک پکایا ہے (کتاب کے ص ۷۷ پر شمولہ نظم "مراجعت" کا سنہ تصنیف ان کے کلیات "چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل" میں ۱۹۷۸ درج ہے) اپنے مکالماتی اسلوب کے باوجود پوری کتاب وحدتِ خیال و وحدتِ تاثر کی ایک طویل لڑی میں اسی طرح پروئی ہوئی ہے جیسے وزیر آغا کی نظمیں (بطورِ خاص طویل نظمیں) مل کر ایک زنجیرِ خیال بناتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں کو ان کی نظموں میں بااعتبارِ موضوع، یکسانیت کا احساس ہوتا ہے (جو ہر گہری سوچ والے نظم نگار کا مقدر ہے خواہ وہ اقبال ہو یا فیض) کتاب میں جگہ بہ جگہ جس تمثیلی، استعاراتی، علاماتی طرز میں پیچیدہ خیالات کے فولاد کو موم جیسا نرم بنایا گیا ہے وہ بھی میرے اس خیال کی تائید میں ہے بطورِ خاص اس کا بابِ چہارم (چوتھا دن) اس پہلو سے لائقِ توجہ ہے۔

مثنوی "سحر البیان" کے سلسلے میں عام طور پر ناقدین کا خیال ہے کہ میر حسن نے اپنی پچھلی تمام مثنویوں کا تجربہ اور نچوڑ اس آخری مثنوی میں سمو دیا ہے۔ "دستک اس دروازے پر" کے باب میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ نظم کی باتیں کہہ چکا ہوں خود مصنف نے اپنی نو نظمیں اس کتاب میں کھپائی ہیں نیز یہ کہ تحریر کا اندازِ تخلیقی ہے پھر ہر باب میں کسی نہ کسی لہجے سے ادبی موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں یعنی وزیر آغا نے تخلیقی تنقید کے نمونے اور اپنے تنقیدی نظریات، اس تصنیف میں غزل جیسے اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کر دیئے۔ مکالمات کی چستی میں ڈرامے کی سی شان ہے اور اندرونِ ذات اور وسیع کائنات کا مشاہدہ ایک کھلی آنکھوں والے سیّاح کی طرح کیا گیا ہے۔ پھر جو گُھلاؤ کا طرزِ اظہار اختیار کیا گیا ہے اور گہرے، بلیغ خیالات اور نازک احساسات بے تکلفانہ بیان اس کتاب کے ہر باب میں بکھرا ہوا ہے وہ کسی اچھے انشائیہ نگار کے قلم سے ہی وجود میں آسکتا تھا ذرا یہ پارہ پارہ فقرے ملاحظہ ہوں:

"فلاسفر وحدت کو سوچتا ہے، صوفی اسے محسوس کرتا ہے جب کہ فنکار چاہتا ہے کہ اسے دوبارہ تخلیق کرے" (ص۔۵۲)

"لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ سوچ کی بیماری سب چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا قلع قمع کر دیتی ہے" (ص۔۵۳)

"کہیں ایسا تو نہیں کہ خود ہماری نکتہ آفرینی نے یہ سارا فکری جھنجھٹ کھڑا کر رکھا ہو" (ص۔۵۷)

سچ کے معنی لغت میں دیکھو تو اس کے سامنے چار پانچ الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے ان میں سے ہر لفظ کے معنی جاننے کے لئے تم لغت دیکھتے چلے جاؤ، کسی متعین معنی تک نہ پہنچ پاؤ گے"

(ص ۔ ۱۵۷)

"اپنے ملازم سے کہو مجھے گرم گرم چائے کی ایک پیالی لادے تاکہ میرے دماغ کے دونوں پلڑے برابر ہو جائیں" ۔ (ص ۔ ۱۶۶)

"کوئی غم کی حالت میں چاند کو دیکھے تو ایک موٹا سا آنسو دکھائی دے اور اگر خوشی کے عالم میں دیکھے تو ایک بڑا سا آبدار موتی نظر آئے"

(ص ۔ ۱۷۶)

ایسے ہی رواں دواں اور شگفتہ بات چیتی انداز میں کتاب کے اوّل تا آخر تک ابتدا سے آفرینش کائنات کے لمحہ بہ لمحہ بنتے بگڑتے عناصر، تہذیبوں کے عروج و زوال، ارتقائے نسل انسانی کے مراحل، تصوف، تہذیب، مذہب، ادب، ثقافت، اور مختلف تنقیدی دستکاری کے بارے میں بیش بہا معلومات شامل ہیں۔

بطور خاص تازہ ترین سائنسی انکشافات کے تناظر میں ادبی امور اور تنقیدی نظریوں پر "میں" اور "تو" کے مابین مکالمے نہایت، خیال انگیز اور معلومات افزا ہیں۔ ساختیات اور پس ساختیات جیسے دبیز مباحث کو متصوفانہ طرز فکر سے آمیز کرتے ہوئے وزیر آغا نے ان ادبی نکات پر نئے زاویوں سے غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ اور سائنسی مادیت کو صوفیانہ جمالیات سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

۱۹۲ صفحے کی یہ کتاب عمدہ، دبیز کاغذ اور روشن طباعت کے ساتھ مضبوط اور خوبصورت جلد میں منظر عام پر آئی ہے اور اس کی قیمت پچاس روپے ہے۔ پاکستان میں اس کا ناشر "مکتب فکر و خیال (لاہور)" ہے اور ہندوستان میں اسے مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ (نئی دہلی) نے چھاپا ہے۔ مبصر کے پیش نظر کتاب کا غیر ملکی ایڈیشن رہا ہے۔

مبصّر:
انیس رفیع

شموئل احمد افسانہ نگار ہیں۔ ایک عمر گذاری ہے اس دشت کی سیّاحی میں۔ اور "دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے" کے مصداق ناول نگاری کے میدان میں بھی بے خطر کود پڑے ہیں۔ خوش آمدید

سب سے پہلے یہ بات صاف کر دوں کہ گرد پوش پر بلراج کومل کے خیالات تنقیدی لفظیات نیز اصطلاحات کی Jumbling ہیں اور کچھ نہیں۔ ان میں جو فلسفہ طرازیاں اور غیر متعلق مبہم پیرایۂ اظہار ہے ان کا اطلاق اس ناول کے کردار و واقعات پر بالعموم ہو تو ہو بالخصوص نہیں ہوتا۔ بلراج کومل صاحب کی آرا ء محض اس لئے چھاپی گئی ہیں کہ گرد پوش کا فلیپ کورا نہ رہ جائے۔ بہتر ہوتا کہ یہ ریڈی میڈ فری سائز بھاری بھرکم جملے Flap پر نہ ہوتے۔

دکھ ہوتا ہے اردو میں تبصرہ نگاری کے چلن کو دیکھ کر۔ چند معتبر نقادوں اور مبصّروں کو چھوڑ کر (جیسے شمس الرحمٰن فاروقی) بیشتر ناقدین و مبصرین ریڈی میڈ فری سائز کرتے کی طرح تبصرے تیار رکھتے ہیں۔ کوئی بھی افسانوی مجموعہ ہو، ناول ہو اسے یہ فری سائز کرتا پہنا دیتے ہیں۔ آپ چونک جائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ اس نوع کے تبصروں کے پیشروؤں میں سید احتشام حسین مرحوم بھی شامل تھے۔ ممکن ہے کہ انکار کر کے احتشام صاحب کسی کا دل نہ دکھانا چاہتے ہوں کہ وہ انتہائی شریف النفس اور وضع دار واقع ہوئے تھے مگر ادب کی صحت کے لئے نقادوں میں اتنی سنگدلی اور سفّاکی ضرور ہونی چاہیئے جتنی کہ ایک کامیاب سرجن یا جرّاح میں ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نقّاد و مبصّر فنّی صحت کے ضامن ہوتے ہیں۔ مدیران اور مصنفوں کا بھی یہ فرض ہوتا ہے کہ غیر ضروری تبصروں اور نقد کے لئے مبصروں اور ناقدوں پر دباؤ نہ ڈالیں۔ دباؤ میں آکر لکھنے کا نتیجہ وہی فری سائز کرتا ہوگا۔

شموئل احمد کا یہ چار ابواب پر مبنی ناولٹ محض تین کرداروں پر صرف ہوا ہے۔ مرد کردار نرگسیت کا شکار، عورت فطرت سے ہم آہنگی کی طلب گار، باپ ایک معتدل رویّے سے دوچار ہے۔ ان تینوں کے

مابین رشتوں میں مفاہمت کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ ناولٹ پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیاں، ان کے راست، جذباتی ردعمل، اشیاء اور انسانی متعلقات کی جانب غیر فطری رویہ کا بیان بڑے فنکارانہ انداز میں ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گوتم بدھ کے زمانے سے ارتقا پذیر ہندستانی اخلاقیات اقتدار و مذہب کے اختلاط کے نتیجے میں ۱۸ ویں صدی تک آتے آتے بالخصوص جنسی اخلاقیات جبر کی صورت اختیار کر گیا اور برصغیر کی عورت نسوانی شرم و حیا کے نام پر ڈبے میں بند ہو گئی۔ شموئل احمد اپنے اس کردار ناولٹ میں ایک ایسے نسوانی کردار کی تخلیق کرتا ہے جو باشعور و باخبر ہے۔ شموئل احمد نے کوشش کی ہے کہ اس کردار کے حوالے سے فرسودہ جنسی اخلاقیات اور رسومات کہنہ پر کاری ضرب لگائی جائے۔ شاید وہ ترگنیف Turgenev ٹالسٹائی Tolstoi منشی پریم چند یا دستو یوسکی Dostoyevsky کے اس اخلاقی اسکیم کی نفی کرنا چاہتے ہیں جن میں فکشن کے یہ معمار اپنے کرداروں کو ڈھالتے رہے ہیں۔ ڈی ایچ لارنس کے نزدیک ان کے یہ کردار بے کیف، باسی اور پژمردہ ہیں خواہ یہ کردار کتنے ہی عظمت والے قرار کیوں نہ دیئے جائیں۔ اردو میں منٹو اور بیدی نے لارنس کی نہج پر کام شروع کر دیا تھا۔ مگر انہوں نے لارنس کی لیڈی چیٹرلی لوز (Lady Chatterly's Lover) ' (The Rainbow) اور Sons and Lovers, کی طرح جنسی فعل کی عریاں تصویر کشی سے گریز کیا (ممکن ہے ان پر دقیانوسی ہونے کا الزام آجاتا)۔ شموئل احمد نے اس جانب ایک خفیف سی جنبش کی ہے ملاحظہ کیجئے (" تب اس کے ہاتھوں کو اس نے پرے کرنا چاہا لیکن اس نے گرفت سخت کر لی اور سلیپنگ گاؤن کے بٹن کھولنے لگا۔ پھر ایک دو بار گردن ہلا کر اس کے دو چار بوسے لئے ..... تب کمرے کی زرد روشنی میں اس نے ایک بار اس کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے پستان کو ہاتھوں میں لیکر طرح طرح کی شکلیں بنا رہا تھا... اس نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ اس طرح عورت کا پستان ہاتھ میں لو اور زور زور سے ـــــ ...) اپنی اس رائے سے میں ہرگز یہ باور نہیں کرانا چاہتا کہ ان معنوں میں منٹو یا بیدی شموئل احمد کے مقابلے میں Backward تھے۔ میں نے یہاں محض شموئل احمد کی عریاں بیانی کے نمونے کے طور پر یہ اقتباس پیش کیا ہے۔ منٹو اور بیدی وہ عظیم فنکار تھے جن کا ایک لفظ ان کی Writing scheme کی ضرورت کے تحت استعمال ہوتا تھا۔

ندی استعارہ ہے فطری آزادی، بہاؤ، روانی اور نغمگی کا۔ شموئل احمد انسانی زندگی کو ندی کے رخ پر دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ ہماری استعماری تہذیب نے آدمی کے فطری بہاؤ پر قریہ قریہ جو بند

باندھے ہیں وہ اسے توڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔ UGC اسکالر لڑکی کے کرداری تخلیق
شاید اسی مطمح نظر کے تحت کی ہے۔ مگر اس کردار کی تعمیر میں یہ خیال رکھا ہے کہ کمزور ناول نگاروں
کی طرح یہ کردار اخلاقی کرد و امتناع کا اشتہار نہ بن جائے۔ اس لڑکی کا کرب مسلسل میں مبتلا ہونا
Male Chauvanism سے گلے گلے نفرت، کا اظہار قارئین کو شموئل احمد کے
مطمح نظر کا حمایتی بنا لینے میں کامیاب رہا ہے۔

مگر جنسی آزادی یا مروجہ جنسی اخلاقیات سے انحراف اس ناول کا تھیم نہیں ہے۔ یہ تو ننئی
باتیں ہیں۔ اصل موضوع تو Ecological Balance ماحولیاتی یا ارضی توازن
ہے۔ اس موضوع کو شموئل احمد نے بڑے Subtle انداز میں چھوا ہے۔ شاید اسی کی
Subtlety کی بنا پر بابا، کومل اور دیوندر اسر اس کی جنسی بھول بھلیوں میں رہ گئے۔ ان
دنوں ماحولیاتی آلودگی اور ارضی توازن کا بگاڑ چرچا ہے۔ دنیا کا ہر باشعور شخص اس خطرے سے مضطرب
ہے اور شموئل اسے بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے آپ لڑکی کے گھر کے Location پر غور کیجئے۔ گنگا کا کنارہ، کھلی فضا
اور ایسے میں یہاں مقیم وہ لڑکی جو عالم نزع کی کیفیتوں پر تحقیق کر رہی ہے۔ Parapsychology
کی یہ طالبہ فطری حسن و توازن کی دلدادہ۔ اس کے والد باغبانی کے شوقین مختلف اقسام کے پیڑ بوٹے
پھول ان کے کمپاؤنڈ کی زینت ہیں۔ گھر کو گنگا ندی کے فطری تناظر سے ہم آہنگ دکھایا گیا ہے۔ مگر یہ
ہم آہنگی LTC گھاٹ اور لاش جلانے کے لئے تعمیر شدہ Electric Cremetorium
سے مجروح ہوتی ہوئی بھی دکھائی گئی ہے۔ Eco-balance کے
ان خطرات سے صحافی اور دیگر ذرائع ابلاغ کے کارندے ہمیں برابر آگاہ کر رہے ہیں۔ مگر ایک ناول
نگار نے پہلی بار یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ فطری توازن اس دن سے بگڑنے لگا تھا جب انسانی
آبادی نے اسٹیٹ آف نیچر State of Nature سے باہر آکر سماجی اور اخلاقی
ضابطوں سے بندھنے کا معاہدہ کیا تھا۔ پہلے آپس میں، پھر قبیلے کے سردار سے، بادشاہوں سے، چرچ
اور مندروں سے، حکمرانوں سے، آخر میں مختلف قیادتوں سے۔ ذی حس اور حیوان ناطق ہونے کے ناطے
آدمی نے سب سے پہلے یہ دکھ جھیلا۔ جبری تہذیب نے سب سے پہلے انسانوں کو اپنے چنگل تلے روندا۔ غیر
فطری ضابطے کا مطیع بنا کر انسان کے فطری نشو و نما کو روکا اور اب یہ افتاد جنگل، ندی، پہاڑ، گاؤں اور
شہر پر پڑی ہے۔ اس ناول کی لڑکی اور ندی ایک دوسرے کی علامت ہیں۔ لڑکی ندی کی طرح آزادی

بہاؤ۔ بے رخنہ زندگی چاہتی ہے مگر اس کا شوہر اصولوں اور ضابطوں کی آڑ میں ندی پر بند سے باندھ (DAM) کی طرح اس پر روک لگاتا ہے۔ اس رویے سے وہ دھیرے دھیرے نفرت کرنے لگتی ہے مگر اس کی نفرت اسے انحراف پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ ابدی کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ گنگا ایکشن پلان بھی ندی کے کنارے Electric Cremetorium کی تعمیر کو روک نہ سکا۔ گنگا اور اس کی کھڑکی کے بیچ دھدھکتی ہوئی انسانی لاشوں کی دیوار اٹھ گئی۔ شموئل احمد کا یہ خیال ہے کہ آلودگی سے آزاد ماحول کا تصور اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ معاشرے میں بسنے والا انسان جو خود فطرتی توازن کا ایک حصہ ہے فطری آزادی کے ساتھ زندگی کرنے کا حق حاصل نہ کر لے۔ عالم نزع کی کیفیت، بے رونق اور لاش جلانے والی برقی بھٹی کے ذریعہ شموئل احمد انسانی بھیڑ کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر ایسا ہی ہے تو تیار رہو اجتماعی موت کے لئے۔ اس انسانی بھیڑ کا ایک اہم رکن لڑکی کا شوہر بھی ہے جسے فطری توازن کے بگڑنے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ شہر کے گنجان اور آلودہ علاقے میں آٹھ منزلہ اپارٹمنٹ کے ایک فلیٹ میں بند بہت خوش ہے۔ لڑکی کا ایک پر فضا مقام سے رخصت ہو کر اس بند فلیٹ میں آنا اس بات کی طرف صاف اشارہ ہے کہ فطرت انسانی بالخصوص آہستہ آہستہ شکست کھا رہی ہے اور انسان موت کے دہانے پر آ کھڑا ہوا ہے۔ ہائیڈروجن یا ایٹم بم ہمارے قاتل نہیں۔ ہم لوگ فطرت کشی کرتے ہوئے ہم بھی اپنے قاتل ٹھہریں گے۔

ایک بدصورت موضوع حسن فن کارانہ حسن کے ساتھ اس ناولٹ کا حصہ بنا ہے، یہ شموئل احمد کا ہی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ ایک فیلڈ انجینئر کی حیثیت سے آنے والے خطرے کی پیش آگاہی اور ایک ادیب کی حیثیت سے اس خطرے کی انسانی کرداروں کے نفسیاتی Interaction کے حوالے سے بیانیاتی پیش کش اردو ناولوں کے باب میں سنگ میل کا درجہ حاصل کرنے کے آس پاس نظر آتی ہے۔

جلی حرفوں میں ناولٹ کی کتابت جو اب خال خال نظر آتی ہے آنکھوں کو بہت بھاتی ہے۔ سرورق اور پشت پر جو تصویریں ہیں وہ نہ ہوتیں تو صورت حسن پر رائے ضرور دیتا۔ مجموعی طور پر کتاب کی طباعت اور قیمت اچھی ہے۔

مبصر:
قیصر شمیم
10, Hem Ghosh Lane,
Shibpur-Howrah-711102
West Bengal.

شاہد کلیم نئی نسل کے ان شعراء میں سے ہیں، جو اپنے فکر و فن کے جلوہ صد رنگ کو پیش کرنے کے لئے اپنے نقادوں یا اپنے عہد کے بڑے بڑے نقادوں کی تحریروں کا آئینہ خانہ سجانا پسند نہیں کرتے بلکہ انہیں جو کچھ پیش کرنا ہوتا ہے، اسے بغیر کسی تام جھام کے بلا واسطہ، خود اعتمادی کے ساتھ اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

دوسروں کی تحریروں کے ذریعہ قارئین کے دلوں پر پہلے ہی اپنے فن کی عظمت کا سکہ بٹھانا تاجرانہ روش ہو تو ہو، ادبی روش قطعی نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ شاہد کلیم اس روش کے خلاف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے ۱۹۷۹ء میں جب اپنا پہلا شعری مجموعہ "زیر بار" شائع کیا تھا تو اس وقت بھی کسی دوسرے کی کوئی تحریر انہوں نے اپنے مجموعے میں شامل نہیں کی تھی حتیٰ کہ خود بھی اپنے بارے میں یا اپنی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا، جس کا ایک خوش گوار نتیجہ یہ ہوا کہ "زیر بار" کے بے لاگ مطالعے کے دوران یہی نہیں کہ دل میں شاعر شاہد کلیم کی قدر پیدا ہوئی بلکہ شخص شاہد کلیم سے ملنے کا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔

"موسم موسم روپ" اسی شاعر کا دوسرا شعری مجموعہ ہے، جو پہلے مجموعے کی اشاعت کے دس گیارہ سال بعد منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں بھی شاعر نے وہی مستحسن روش اختیار کی ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ البتہ اس مجموعے میں ایک مختصر پیش لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ پیش لفظ کسی دوسرے سے لکھوایا ہوا نہیں بلکہ خود شاعر کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں موصوف نے اپنے نظریۂ فن اور شعری رویئے پر، فخر و مباہات کے بغیر، روشنی ڈالی ہے اور اس اندازِ بیان سے امکانی حد تک گریز کیا ہے، جس میں قارئین کو قبل از وقت متاثر کرنے والی خصوصیت ہوا کرتی ہے۔ "موسم موسم روپ" کے شاعر کی فکری جہت اور شعری اسلوب کو بخوبی اور بہ آسانی سمجھنے کے لئے اس پیش لفظ کے بعض نکات سے مدد لی جاسکتی ہے۔

شاہد کلیم اس بات کے قائل ہیں کہ " شاعری خیالات، محسوسات کو حیات و کائنات کے وسیع تناظر میں پیش کرنے کا ایک خوبصورت ذریعہ ہے" اور " اچھی شاعری کی سب سے بڑی خوبی اس کی نغمگی ہے" نیز یہ کہ " بحر و وزن کی شکست و ریخت سے نغمگی مرتی ہے" چناں چہ نغمگی اور بحر و وزن کے اسی تصور کے تحت وہ نثری نظم اور آزاد غزل کو پسند نہیں کرتے۔

یہ ممکن ہے کہ شاہد کلیم کے بعض مفروضات سے اختلاف کیا جائے لیکن زیر تبصرہ مجموعے میں شامل ۸۹ غزلوں اور ۲۱ نظموں کے مطالعے کے بعد یہ رائے بہ آسانی قائم کی جاسکتی ہے کہ شاعر نے، اپنے تصورِ نغمگی کے مطابق، اپنی بیشتر تخلیقات میں، بالخصوص غزلوں میں، نغمگی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے" جس کے لئے اس نے مترنم اور رواں بحروں کے علاوہ ایسی زمینیں اختیار کی ہیں، جو اس کے ذوقِ نغمہ گیری کا پورا پورا ساتھ دیتی ہیں۔

شاہد کلیم بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ یہ بات اس لئے نہیں کہی جارہی ہے کہ ان کے مجموعے میں غزلوں کی تعداد نظموں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے، بلکہ اس لئے کہ ان کا فنی جوہر غزلوں ہی میں نمایاں ہوا ہے۔ یہ غزلیں نہایت ترشی ترشائی اور اثر آفریں غزلیں ہیں، جن میں جابجا ایسے اشعار ملتے ہیں جو دل کو چھوتے ہی نہیں، ذہن میں ایک جہانِ معنی بھی روشن کرتے ہیں۔

شاہد کلیم اپنے مخصوص تصورِ نغمگی کی وجہ سے آزاد غزل کہنا پسند نہیں کرتے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بجائے پابند نظم کے وہ آزاد نظم سے شوق فرماتے ہیں! ان کے مجموعے میں صرف ایک معرّیٰ نظم اور باقی تمام آزاد نظمیں ہیں ان نظموں میں کسی نہ کسی تاثر، خیال یا احساس کو رمزیت، اشاریت یا بالواسطہ پیرایۂ اظہار کے سہارے پیش کیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں دھند اور اجالے کی ملی جلی پُر اسرار کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ اس کیفیت کے باوجود غزلوں کی قوس و قزح کے سامنے ان نظموں کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔

" موسم موسم روپ" میں مشاہدات، تجربات اور محسوسات کے جتنے رنگ ہیں، وہ بسا اوقات ذات کے حوالے سے پیش کئے گئے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ شاہد کلیم کی نگاہ ذات کے نہاں خانے میں گم ہوکر رہ گئی ہے اور حیات و کائنات کے تمام خارجی مظاہر ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں۔ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، کیوں کہ شاعر کا نظریہ ہے کہ ہر داخلی کیفیت کی بنیاد کوئی خارجی کیفیت ہی ہوتی ہے اور خارجی کیفیت کو داخلی کیفیت بنا کر پیش کرنا ہی دراصل شاعری ہے۔ چنانچہ شاہد کلیم کی شاعری حیات و کائنات ہی کی شاعری ہے، صرف حوالہ ذات کا ہے، جو ان کے شعری اسلوب کا ایک حصہ ہے اور بس!

شاہد کلیم خود اس بات [illegible] تے ہیں کہ

"ہر ادب اپنے دور اور اپنے حالات کی پیداوار ہے۔ میری شاعری میں بھی اس نئے مشینی عہد کا رنگ و روپ اور بدلتے ہوئے حالات اور وقت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے، تنہائی، کرب، گھٹن، خوف، انتشار، عدم تحفظ، قدروں کی پامالی اور بے چہرگی کا احساس آج حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ زندگی چمکتے ہوئے شہر کی فضا اور ہماہمی سے گھبرا کر سکون اور اطمینان کی تلاش میں اندھیرے جنگل کی طرف بھاگتی ہے۔ اسے جنگل کے گہرے سکوت، اور سبز تاریکی میں اپنا اصلی رنگ کھو دیتی ہے۔ میری شاعری میں اس کھوئی ہوئی بے چہرہ زندگی کی تلاش اور پہچان کی بہت روشن نہ سہی، ہلکی تصویر ضرور دیکھی جا سکتی ہے۔"

اپنی شاعری کے بارے اتنا واضح بیان دینے کے بعد وہ اپنے قارئین کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ

"فکر و خیال اور محسوسات کا مکمل اظہار کسی فن پارہ میں ممکن نہیں۔ دراصل کسی خاص کیفیت کے تحت فن کار کے ذہن سے جس تخلیق کا جنم ہوتا ہے اس کا بھرپور احساس صرف فنکار کو ہی ہوا کرتا ہے۔ اس کیفیت تک قاری کی رسائی بہت ہی مشکل ہے۔ فنکار اپنے قاری کو رنگ، برنگے الفاظ اور صوت و آواز کے ذریعہ اس کیفیت تک پہنچانے کی صرف ایک کوشش کرتا ہے۔"

"موسم موسم روپ" میں شاہد کلیم نے اپنے قاری کو اپنی تخلیقی کیفیات تک پہنچانے کی کیسی کوشش کی ہے، اس کی طرف سطور بالا میں اشارے کئے جا چکے ہیں۔ اب تفصیلی گفتگو کر کے "موسم موسم روپ" کے تمام روپ دکھانا یا مثالاً منتخب اشعار نقل کر کے شاہد کلیم کے فکر و فن کی ایک محدود جھلک پیش کرنا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

جن لوگوں نے "زیر بار" کا مطالعہ کیا ہے، وہ یقیناً یہ محسوس کریں گے کہ اس پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد صرف دس گیارہ سال میں دوسرے مجموعہ "موسم موسم روپ" تک ~~پہنچتے پہنچتے~~ شاہد کلیم کی شاعری نے، نمو پذیری کے کئی مرحلے طے کر لئے ہیں اور ان کے فکر و فن پر ایسا نکھار آ گیا ہے، جس میں ایک خاص کشش ہے، یہ کشش اور بھی بڑھے گی۔ مگر اس کے لئے شرط ہے کہ شاعر کا ذہن اور وسیع ہوتا جائے اور اس کے فکر و خیال اور محسوسات میں مزید گیرائی اور گہرائی پیدا ہو، نیز یہ کہ "موسم موسم روپ" میں زبان و بیان اور فن شاعری کے بعض اصولوں سے روگردانی کی تھوڑی بہت مثالیں ملتی ہیں۔ ان سے شاہد کلیم کی شاعری آئندہ داغدار نہ ہو۔ اگر ان مثالوں پر وہ غور کرنا پسند کریں تو فی الحال اپنے مجموعے کے صرف صفحات نمبر ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۷، ۱۸، ۲۰ اور ۲۶ پر ترتیب وار شعر نمبر ۶، ۶، ۴، ۲، ۶، ۶ اور ۶ دیکھ لیں۔

عمدہ کاغذ، نفیس کتابت و طباعت، اور حسین گٹ اپ کی یہ کتاب صرف چالیس روپے میں مہنگی نہیں ہے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی اور بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ جیسے ادارے اس کے تقسیم کار ہیں۔

اٹھارویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو کے ایک شاعر جاپان پہنچتے ہیں اور کسی طرح ہند کے نواب سمجھے جانے لگتے ہیں۔ چناں چہ ان کی قدر و منزلت اتنی بڑھ گئی کہ موصوف کو بادشاہِ وقت نے سپاسنامہ بھی پیش کیا۔ پھر کیا تھا ضیافتیں ہونے لگیں لیکن یہ ضیافت یکطرفہ نہیں تھی چوں کہ ہند کے نواب تھے لہٰذا جاپانی امرا ان کے یہاں بھی مدعو کئے جاتے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ نواب صاحب کی جیب خالی تھی۔ لیکن دعوت نامے جاری کئے جا چکے تھے نہایت پریشانی کے عالم میں غور و فکر میں غلطاں تھے کہ جاپانی ملازم حاضر ہوتا ہے اور ضیافت کے سامان کی خریداری کے لئے پیسے طلب کرتا ہے۔ ملازم کے اس سوال پر نواب صاحب اسے اس زور سے ڈانٹتے ہیں کہ بیچارہ سہما سمٹا الٹے پاؤں واپس ہو جاتا ہے۔ شام ہوتی ہے مہمان حاضر ہوتے ہیں۔ نواب صاحب کی سانس پھول رہی ہے کہ ملازم دوبارہ حاضر ہوتا ہے اور روایتی سلام کے بعد گویا ہوتا ہے کہ "حضور کھانا تیار ہے"! مسرت خیز جواب پر حیرت ٹوٹنے پر نواب صاحب کو عرفان ہوتا ہے کہ ان کے غصے کی حدت نے معصوم جاپانی کے دل کو اتنا پگھلا دیا کہ اس نے اپنی جیب پر سارا خرچ برداشت کرلیا ـــــ کیا جاپانی اتنے ہی معصوم اور وضعدار ہوتے ہیں یا غیور؟

مبصر:
کلیم حاذق

87, Philkhana 2nd Lane
Howrah - 711101 (West Bengal)

جاوید دانش کا تازہ مجموعہ "مزید آوارگی" کے مطالعے سے جہاں جاپان کی قدیم تہذیبی روایت، زبان و کلچر اور جدید تیز رفتار زندگی کی خصوصیات کی منہ بولتی تصویر ابھرتی ہے ذہن متذکرہ واقعہ اور اس سے جڑے سوالات کی تائید و توجیہ بھی ہوتی ہے۔ جاپان ایشیائی ممالک میں اپنی تہذیب و ثقافت اور معیشت کے لحاظ سے بیحد اہم تصور کیا جاتا ہے کہ اس ملک نے جتنی قلیل مدت میں ہولناک تباہیوں کے باوجود اپنی قوم کے اعتماد کو بحال کیا ہے اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے لیکن ملک اور اس کے عوام کے بارے میں جاننے کی خواہش دنیا کو رہی ہے۔ چند سال قبل مجتبیٰ حسین بھی جاپان گئے تھے اور واپس آئے تو جاپان چلو جاپان چلو

مبصر:
عنبر شمیم

"شاد عارفی - ایک مطالعہ" ۴۴۴ صفحات پر مشتمل ایک ادبی دستاویز ہے جس کے مرتب پروفیسر مظفر حنفی ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی اردو کے ایک صاحبِ طرز و منفرد شاعر اور بلند پایہ نقاد ہیں اور ان کی اب تک کم و بیش ۵۰ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ انہوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اردو دنیا میں اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک الگ مقام بنایا ہے۔

اس کتاب کی شکل میں شاد عارفی سے متعلق اردو کے ممتاز شعرا، ادبا اور ناقدینِ ادب کی تحریروں کا ایک حسین اور معنی خیز گلدستہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے حصۂ اول میں شاد صاحب کے فن اور شخصیت پر ۱۱ مضامین، نقد پارے اور ماہرادب کی تحریروں سے اقتباسات شائع کئے گئے ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصّہ باقیاتِ شاد عارفی پر مشتمل ہے۔ قبل ازیں ڈاکٹر مظفر حنفی نے "کلیاتِ شاد عارفی"، "ایک تھا شاعر" اور "شاد عارفی۔ فن اور شخصیت" میں اپنے استاد کی شعری و نثری نگارشات یکجا کر کے شائع کی تھی۔ باقیاتِ شاد عارفی میں وہ چیزیں یکجا کی گئی ہیں جو مذکورہ بالا کتب میں شامل نہیں تھیں۔ تقریباً ۷۰ صفحات پر مشتمل مکتوباتِ شاد کے علاوہ ان کے ۳ مضامین، ۱۴ نظمیں، ۷ گیت، ۶۲ رباعیات و قطعات اور ۲۱ غزلیں شامل ہیں اور کچھ متفرق اشعار بھی شائع کئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصّہ ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔

شاد عارفی کی شخصیت اور فن پر مظفر حنفی کا مرتب کردہ مضامین کا پہلا مجموعہ "ایک تھا شاعر" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا جس میں مرتب نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ شاد عارفی مرحوم اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جیسے کہ وہ اصلاً تھے ویسے کے ویسے کتابی شکل میں محفوظ ہو جائیں۔ پیشِ نظر کتاب "شاد عارفی - ایک مطالعہ" بھی اسی غیر جانبدارانہ اصول کے تحت ترتیب دی گئی
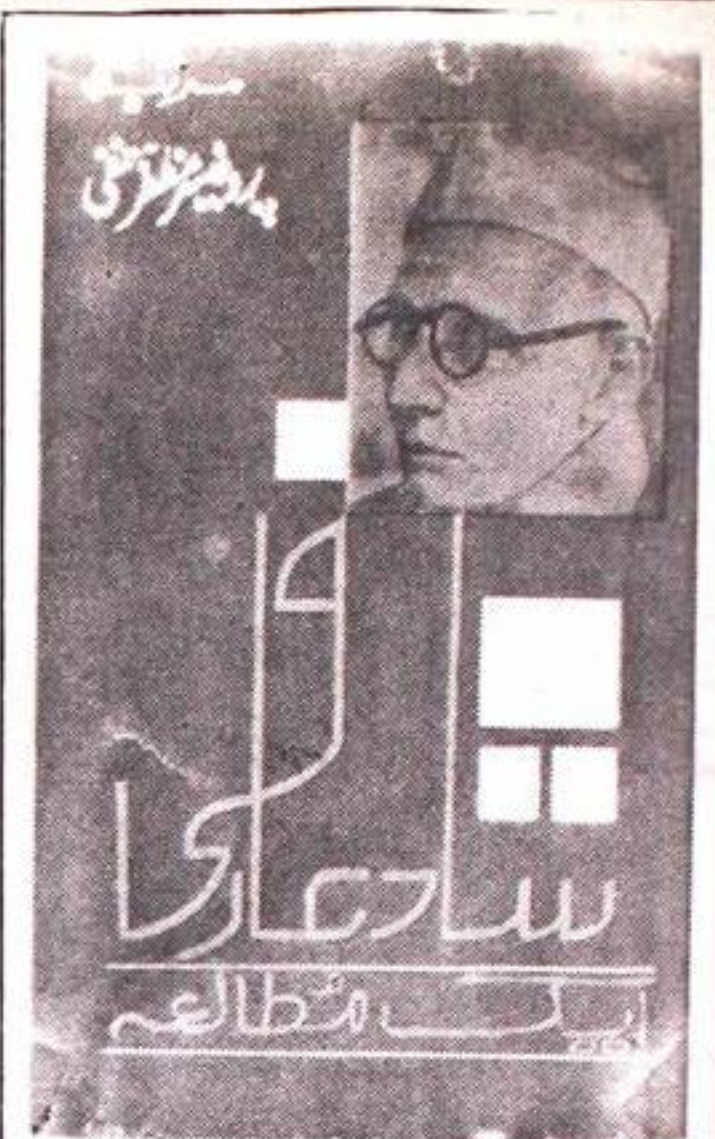
نے ہے جس میں شاد صاحب کی بشری کمزوریوں کو قبول کرنے کے بعد ان کی اصل تصویر کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی بجا طور پر اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ

"اس مجموعے میں شامل پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، بلراج کومل اور چند دوسرے اہل قلم کی نگارشات یا شاد عارفی کی بعض تحریروں کو معروضیت کے اسی اصول کی روشنی میں دیکھا جائے کہ یہ بہر طور اس اہم فنکار کی اصل اور سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش ہے۔"

شاد عارفی اردو کے ایک صاحب طرز اور بے مثل طنز نگار تھے اور ان کا شعری و ادبی سرمایہ اردو زبان و ادب کے لئے ایک متاع بے بہا ہے، وہ ایک نڈر اور جرأت مند شاعر تھے اور اپنے منفرد انداز سخن کے باعث اردو کے دیگر شاعروں میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے، عمیق حنفی کی زبان میں۔

"شاد عارفی رام پور کی روایت پسند مٹی سے برق غضبناک بن کر اٹھے اور آسمان سخن کے دامن کو بجلیوں سے بھر گئے۔ میں نے جب اردو شاعری کا مطالعہ سنجیدگی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ شروع کیا تو یگانہ اور شاد عارفی نے مجھے اردو شاعری بالخصوص غزل کی شاعری میں جدت، بغاوت، تجربے اور ندرت ادا کے امکانات کا قائل کیا اور وہ غزل جو کوٹھوں اور خانقاہوں درباروں اور بازاروں کی رونق تھی پہلی بار ایک گھریلو مگر سوشل، زندہ دل، حاضر دماغ، ذی فہم، ذی علم، ذہین اور باشعور خاتون نظر آئی۔"

اس کتاب میں شامل بیشتر مضامین ان مشاہیر شعرا و ادبا کی نوک قلم سے صفحۂ قرطاس پر مرقوم ہوئے ہیں جن کی ادبی و تنقیدی حیثیتوں کی پوری اردو دنیا معترف ہے۔ حفیظ جالندھری، ضیا احمد بدایونی، میراجی، فراق گورکھپوری، اختر انصاری، بلراج کومل، آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی وغیرہ کے مضامین شاد صاحب کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں، بعض تحریریں جو معروضی نکتۂ نظر سے لکھی گئی ہیں ان میں بھی جہاں شاد صاحب کے خیالات سے اختلافات کے گوشے نکالے گئے ہیں وہیں ان کی علمیت اور شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا گیا ہے، مثال کے طور پر شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے۔

"شاد عارفی بہر حال ایک عہد ساز شاعر تھے، ان کے بعد آنے والے ہر شاعر اور علی الخصوص نئی غزل کے ہر شاعر نے ان سے اکتساب فیض کیا ہے۔

زمانے نے ان کی خاطر خواہ قدر نہ کی!
فاروقی آگے لکھتے ہیں :۔

"اردو شاعری کی یہ بدنصیبی ہے کہ جب تک وہ کسی سیاسی یا تہذیبی ادارہ سے منسلک نہ ہو، اس کی قدر شناسی خاطر خواہ نہیں ہوتی۔ شاد صاحب کو دونوں طرح کی محرومیاں ملیں۔ نہ گھر کے فارغ البال اور خوش و خرم اور نہ ادبی دنیا میں باقاعدہ اور حسبِ مرتبہ قدر و منزلت لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید ان کی شاعری میں یہ دم خم، یہ تیور اور یہ اکھڑ پن نہ ہوتا۔"

زیرِ نظر کتاب میں شامل شاد صاحب کے مضامین بھی دعوتِ فکر دیتے ہیں خصوصاً "روایت اور انفرادی صلاحیت" ایک غور طلب مضمون ہے اور اس سے شاد صاحب کے منفرد نکتۂ نظر کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ مکاتیب کا حصہ کافی وقیع ہے۔ بعض ایسے خطوط بیحد معلومات افروز ہیں جن میں ادبی و نظریاتی مسائل سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

شاد عارفی نے نہایت کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزاری اور حسبِ مرتبہ قدر و منزلت بھی نہیں ملی اس کے باوجود یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ ایک خوش قسمت شاعر تھے جنہیں مظفر حنفی جیسا شاگرد مل گیا۔ غالب کے عہد میں غالب کو بھی حسبِ مرتبہ قدر و منزلت نہیں ملی تھی جس کے وہ حقدار تھے مگر حالی نے "یادگارِ غالب" لکھ کر غالب کو امر کر دیا۔ اس طرح پروفیسر مظفر حنفی لائقِ ستائش ہیں کہ انہوں نے حالی کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

"شاد عارفی ۔۔ ایک مطالعہ" ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، کاغذ نفیس، طباعت عمدہ اور کتابت دیدہ زیب ہے۔ ۷۵ روپے میں یہ کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

وفیات

کیف عظیم آبادی دسمبر ۹۳ کے آخری ہفتے میں پٹنہ میں انتقال کر گئے۔ مرحوم جوان العمر شاعر تھے اور مشاعروں میں کافی مقبول تھے۔

شکیلہ اختر ۹ فروری کو انتقال کر گئیں۔ یہ اردو کے مشہور ناقد، افسانہ نگار اور شاعر ڈاکٹر اختر اورینوی کی رفیقۂ حیات تھیں، خود بھی افسانہ نگار تھیں، ان کا شمار اردو کی اہم خاتون افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی۔

کلام حیدری گیا میں ۲ فروری کو وفات پا گئے۔ مرحوم ایک اچھے ادیب اور افسانہ نگار تھے۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ جریدے "مورچہ" اور ماہنامہ "آہنگ" ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے فروغ کے لئے ان کی بے غرضانہ کوششوں کے غماز ہیں۔

جاوید وششٹ ۲۸ جنوری کو فتح پور بلوچ میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ عمر تقریباً ۷۰ اور ۷۵ کے درمیان تھی۔ اردو کے ایک اچھے استاد، دکنیات کے نکتہ رس، محقق، پختہ مشق شاعر اور نثار تھے۔

سعادت علی صدیقی ۱۳ فروری کو لکھنؤ میں وفات پا گئے۔ مرحوم مہاتما گاندھی ڈگری کالج، سنبھل میں شعبۂ اردو کے استاد اور اردو تحریک کی بڑی فعال شخصیت تھے۔ ایک درجن سے زائد کتابیں شائع کیں۔ انتقال کے وقت ۶۹ برس کے تھے۔

عبدالحئی ۲۰ فروری کو دہلی میں وفات پا گئے۔ ان کی عمر ۵۹ سال تھی اور دہلی یونیورسٹی

میں اردو کے استاد تھے۔ محمد علی طبیب پر ان کا تحقیقی مقالہ اور کامو کے مشہور ناول Out-Sider کا ترجمہ "بے گانہ" ان کی یادگار کتابیں ہیں۔

شمس الزماں ۲۰ مارچ کو آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں انتقال کر گئے۔ مرحوم معروف صحافی اور سماجی کارکن تھے۔ ادبی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی زندگی میں ہمیشہ سرگرم اور پیش پیش رہنے والے شمس الزماں کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں بھاگل پور میں ہوئی تھی۔ صحافتی زندگی کا آغاز کلکتے سے کیا اور اردو کے کئی اخبارات سے منسلک رہے۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبار "سیاست" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ مرحوم ظ۔ انصاری کی ادارت میں شائع ہونے والا جریدہ "آئینہ" کی ادارتی ذمہ داری میں بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔ کلکتے سے ۱۹۷۱ میں دہلی چلے گئے اور وہاں کی سماجی و ادبی زندگی میں سرگرم ہو گئے۔ فلم سنسر بورڈ کا ممبر ہونے کے علاوہ آرگنائزیشن آف انڈراسٹینڈنگ اینڈ فریٹرنیٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ دہلی اردو اکاڈمی نے گزشتہ سال انہیں قومی یکجہتی ایوارڈ سے نوازا تھا۔

محمود انصاری روزنامہ "منصف" کے چیف ایڈیٹر کا سعودی عرب کی راجدھانی ریاض کے شاہ فیصل اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۵۴ برس کے تھے۔ مرحوم پچھلے چھ برس سے کینسر کے عارضے میں مبتلا تھے اور شاہ فہد کے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ شاہ فیصل اسپتال میں ان کا علاج چل رہا تھا۔ ان کو ریاض ہی میں دفن کیا گیا۔

ہیرالال چوپڑا ۲۱ جنوری ۱۹۹۷ء کو ۲ بجے دن کلکتہ میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۸۱ سال تھی۔ ڈاکٹر چوپڑہ اردو، فارسی اور انگریزی کے اسکالر تھے۔ وہ تقسیم ملک کے بعد لاہور سے کلکتہ آئے تھے اور یہیں بس گئے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر میں پروفیسر رہے۔ انہوں نے فارسی زبان میں تہران یونیورسٹی سے ڈی لٹ کیا تھا۔ موت سے چند ہفتوں قبل ان میں کینسر کا مرض دریافت کیا گیا تھا۔

ڈی۔ راج کنول ۱۶ جنوری ۱۹۹۴ کی شام کو رحلت کر گئے۔ ان کا تعلق داغ اسکول سے تھا اور ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

خلیق ٹونکی ۲۶ جون کی شام اپنے آبائی وطن ٹونک میں انتقال کر گئے۔ انکی عمر ۶۲ برس تھی۔ انہیں ان کے فن خطاطی کی وجہ سے ۱۹۸۴ میں غالب سب ایوارڈ اور ۱۹۸۵ میں نیشنل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تھا۔ دہلی اردو اکاڈمی کی جانب سے انہیں ۹۳-۱۹۹۲ کا بہترین اردو خطاطی ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

تفصیل بلراج مینرا کی مرتب کردہ کتاب "دستاویز" میں ملتی ہے، وہ کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ غالباً ڈاکٹر گیان چند کی نظر سے یہ کتاب نہیں گزری۔ مظفر حنفی کی غزل پر ڈاکٹر وزیر آغا کا تنقیدی جائزہ اور سائیکل مدھو سودن پر شہزاد منظر کا تعارفی مضمون عمدہ ہیں۔ زور-تی رقص پر احمد سلیم کا مضمون آج کے اردو قارئین کے لئے اہم ہے۔ آرٹ اور کلچر پر اگر آپ اس نوعیت کے مضامین آئندہ بھی شائع کریں تو بہت اچھا ہو۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی موت کو میں اردو دنیا کا ایک بڑا سانحہ سمجھتا ہوں۔ حیدرآباد سے جب وہ مستقل طور پر کلکتہ آگئے، تو میں ان کے اولین شناساؤں میں تھا۔ آپ نے ان پر ایک مختصر گوشہ دے کر ان کی یاد کو تازہ تو کیا۔

سیاہ پٹی میں چھپے ہوئے بعض لکھنے والوں کے نام طباعت میں صاف نہیں ابھرے۔ آئندہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

● مظہر امام، دہلی

آپ کا سہ ماہی "دستک" ابھی ابھی موصول ہوا۔ اتنا خوبصورت اور معیاری جریدہ شائع کرنے پر مبارکباد قبول کیجئے۔ اللہ اسے طویل عمر عطا فرمائے۔ اردو میں اور وہ بھی ہندوستان میں اور وہ بھی کلکتہ جیسے شہر سے اتنا معیاری جریدہ شائع کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کی کتابت، طباعت اور معیار دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی ہوئی۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ علاقائی جریدہ نہیں ہے۔ اس میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان کی بھی نمائندگی ہے۔ اگر اس میں بنگلہ دیش کے اہلِ قلم کو بھی شامل کر لیا جاتا تو بلاشبہ یہ جنوبی ایشیا کا نمائندہ اردو مجلہ بن جاتا۔ بہرحال! آئندہ شمارے میں بنگلہ دیش کے اہلِ قلم کو بھی شامل کیجئے گا۔ (اگر ان کے نام اور پتے معلوم نہ ہوں تو مجھے لکھئے گا۔) یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں کلکتہ کے کئی اہم لکھنے والے شامل نہیں ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ آپ کے ان سے اختلافات ہوں اور آپ نے ان سے رجوع نہ کیا ہو؟ میرا خیال ہے کہ قبولِ عام جریدہ شائع کرنے کے لئے تمام قسم کے اختلافات اور تعصبات سے بلند ہونا ضروری ہے۔ صرف اسی طرح آپ خطہ کی بھرپور نمائندگی اور ترجمانی ہو سکتی ہے۔

اس میں کئی مضامین، نظمیں اور غزلیں عمدہ ہیں۔ ان میں خصوصاً شانتی رنجن بھٹاچاریہ پر محمد سلیمان خورشید کا اور خود آنجہانی شانتی کا مضمون۔ ان کا مضمون بلاشبہ اس قابل ہے کہ اسے دوسرے رسالوں میں نقل کیا جائے۔ انہوں نے کلکتہ اور بنگال کی متعدد لائبریریوں میں تحقیق و جستجو کے بعد جن مخطوطات کا سراغ لگایا ہے وہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ ان کے اس مضمون سے تحقیق کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔ گیان چند کا مضمون "اردو اور سریانی" بھی خوب ہے۔ وہ اگرچہ بنیادی طور پر محقق ہیں لیکن انہوں نے نظم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف بہت خوب ہے

بلکہ اس سے ان کی دقتِ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ منیر الدین احمد کے "نثری نظم" کے تحت "یہ بھی ایک مضمون ہے۔ اس سے فرانسیسی اور مغربی زبانوں میں نثری نظم کی روایت کا علم ہوتا ہے۔ وزیر آغا نے ممتاز حنفی سے الفا[illegible] کیا ہے۔ "ثقافت" کے عنوان سے ہندوستانی رقص پر احمد سلیم کا مضمون شائع کرکے آپ نے اردو رسائل کی روایت شکنی کی ہے۔ عام طور پر اردو کے ادبی رسائل میں سوائے شعر و ادب کے اور کچھ نہیں ہوتا اور فنونِ لطیفہ سے تو اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

الیاس احمد گدی کا افسانہ بہت خوب ہے لیکن ان کی زبان پر حیرت ہے۔ وہ تو بہت اچھی اور خوبصورت زبان لکھتے تھے۔ یہ انہوں نے کیسی زبان لکھی ہے؟ دوسرے افسانے بھی بہت اچھے ہیں۔ تراجم کے سلسلے میں عرض ہے کہ اصل مصنف کا نام ہونا ضروری ہے ورنہ اصل مصنف کا کارنامہ مترجم کے کھاتے میں نہیں جانا چاہیے اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اس افسانے اور اس کے مصنف کا اس کی اصل زبان میں کیا ادبی قدر و قیمت ہے۔ ترجمہ صرف غیر معمولی افسانے کا شامل ہونا چاہیے۔

● شہزاد منظر، کراچی

سہ ماہی "دستک" ملا۔ کھولا جستہ جستہ دیکھا۔ ایمان کی بات ہے کہ آپ نے بڑا اچھا پرچہ نکالا ہے۔ اردو کے معتبر ترین ایسے رسالے کم ہی ہیں۔ پروردگار اس کی عمر دراز کرے۔

● کالیداس گپتا رضا، بمبئی

"دستک" کا پہلا شمارہ دستیاب ہوا۔ رسالہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ رسالہ صورت اور معنی دونوں اعتبار سے خوب ہے اور اردو کے صفِ اول کے رسالوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے پہلے ہی شمارے میں اتنے سارے اچھے ادیبوں کو یکجا کر لیا ہے یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ انتخاب، ترتیب، تزئین سب سے آپ کی خوش سلیقگی ٹپکتی ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔

ادبی رسائل کے خریداروں کا دائرہ صرف ادیبوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے اگر ان رسائل کو زندہ رکھنا ہے (یعنی اگر "اردو ادب" کو زندہ رکھنا ہے) تو یہ ادیبوں کا فرض بنتا ہے کہ ان کی توسیع اشاعت کے لیے کوشش کریں۔ ہمیں ہندوستان بھر کی اردو اکاڈمیوں سے بھی مطالبہ کرنا چاہیے کہ جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر یہ ہندوستان کے تمام ادبی رسائل کے مالی تعاون کے لیے بجٹ مختص کریں۔ سرکاری اشتہارات حاصل کرنے کے سلسلے میں بھی کوشش کرنی چاہیے۔ دوسرے ذرائع سے سرکار کا نقطۂ نظر اردو والوں تک پہنچ نہیں پا رہا ہے اس لیے اردو رسائل کے توسط سے سرکار کو یقیناً فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس جانب حکومت کی توجہ مبذول کرانی چاہیے۔ ان امور کے سلسلے میں تمام مدیروں کی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے۔

● کرامت علی کرامت، کٹک

"دستک" نے پہلی چونکایا پر انداز طرز، متوجہ کیا۔ اپنے سامنے سادہ لیکن پرکشش سرورق کے ساتھ خوبصورت رسالہ کو دیکھ کر کچھ حیران ہوا اور بہت خوش ہوا۔ مغربی بنگال اور اردو دشمنی کے اس دور میں بھی اردو کے عاشقوں کی کمی نہیں۔ ورق گردانی کی تو عنبریں خوشبو سے دل و دماغ مہک اٹھے۔ اچھے ادب کو سلیقہ کے ساتھ پیش کیا جائے تو ادب کی ادبیت چمک اٹھتی ہے اور اثر و تاثیر میں بھی دوگنی ہو جاتی ہے۔ "دستک" کی آواز کانوں میں پہنچی ہی تھی کہ دل و دماغ کو متاثر کر گئی۔ آپ کے لئے اور "نوزائیدہ" دستک کے لئے بہت بہت دعائیں دل سے نکلیں۔ اللہ دونوں کو نظر بد سے بچائے اور صحت مند و توانا رکھے۔

کسی شاعر کا یہ شعر اکثر زبان پر آجاتا ہے:

سب مرے چاہنے والے ہیں مرا کوئی نہیں
میں تو اس ملک میں اردو کی طرح رہتا ہوں

اور دل و دماغ کو افسردہ کر جاتا ہے۔ شاعر نے اردو کے ساتھ ہمارے خود غرضانہ رویے کی تصویر کشی ایک خاص انداز سے کر کے اس کی بے بسی اور بے کسی کی مظاہرہ پیش کر دی ہے۔ لیکن عبد الرحیم جیسے لوگوں کے جب عزائم دیکھتا ہوں تو دل میں امید کی کرن پھوٹنے لگتی ہے اور یقین سر اٹھا کر آواز دینے لگتا ہے کہ — ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

ورنہ جہاں اردو کو دیکھتا اور سنتا ہوں جماعتوں سے شکایت ہے زبان اپنی ذات میں گم شدہ نہیں ہے بلکہ اس کا حال یہ ہے:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

اس رسالہ کا ظاہر جتنا اچھا ہے باطن اس سے کہیں زیادہ اچھا ہے۔ ترتیب، تزئین کے ساتھ ساتھ ادب پارے بھی خوب ہیں۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔

جی چاہتا ہے کہ آپ کے اس رسالہ کے ذریعہ مغربی بنگال کے ادیبوں اور شاعروں کا تعارف بھی ہوتا رہے اور وہاں کے ادبی سرمایے کا جائزہ بھی لیا جاتا رہے تاکہ تاریخ ادب اردو میں مغربی بنگال کو اس کا جائز حصہ ملتا رہے۔

● عبد القوی دسنوی، بھوپال

"دستک" کا پہلا شمارہ مل گیا تھا مگر اپنی بیماری کے باعث جواب میں تاخیر ہوئی جس کا افسوس ہے۔

جب بھی کوئی اچھا پرچہ منظر عام پر آتا ہے تو دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ اردو زندہ ہے اور یہ دشمنوں کے حملے سے مرنے والی نہیں ہے۔ "دستک" دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ پہلے ہی شمارہ میں اس قدر اہم مضامین کو جمع کر لینا آپ کا کارنامہ ہے۔ جب بنیاد ہی اس قدر مضبوط ہے تو اس پر تعمیر ہونے والی عمارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مضامین میں "[illegible] اور غزل" اور ابو سلیم کا "ہندوستانی رقص" اہم مضامین ہیں۔ منیر الدین احمد کا مضمون نثری نظم کے حق میں اگرچہ بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے مگر خوب ہے۔ نظموں اور غزلوں کا انتخاب معیاری ہے۔ مرزا حامد بیگ کا افسانہ "کار زوال" پسند آیا لیکن پورے پرچہ میں ڈراما یا ڈرامے پر کوئی مضمون نہ ہونے سے مایوسی ہوئی۔ اس صنف کی طرف بھی توجہ دیجئے۔

بہرحال اس قدر شاندار اور خوبصورت پرچہ نکالنے پر مبارکباد قبول فرمایئے۔ خدا "دستک" کو طویل عمر عطا فرمائے۔ آمین۔

● ابراہیم یوسف، بھوپال

"دستک" سہ ماہی کی سوغات کا بے حد شکریہ اور برسوں بعد مشرقی ہندوستان سے اردو کا ایک قابل قدر رسالہ نکالنے پر دلی مبارکباد۔

رسالہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اسے اپنے پہلے ہی شمارے میں صف اوّل کے ادیبوں اور شاعروں کی چیزیں حاصل ہو گئیں۔

مضامین کا حصہ اور تخلیقی ادب کا حصہ دونوں ہی متوازن ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اتنے معتبر الرتبہ ادیبوں کی قلمی اعانت اور آپ کی مدیرانہ صلاحیت "دستک" کو ایک منفرد رسالے کی شکل دینے میں زیادہ دیر نہیں لگائے گی۔

جس طرح ہر کلام موزوں شعر نہیں ہوتا اسی طرح مضامین افسانے نظمیں غزلیں تبصرے اپنی موجودگی کے باوجود ہر رسالے کو رسالہ نہیں بنا پاتے۔ لہٰذا اگر آپ اپنے رسالے کا کوئی مزاج متعین کر سکے تو یہ آپ کی حقیقی کامیابی ہوگی۔ میں آپ کے لئے ایسی ہی کامیابی کا متمنی ہوں۔

● [illegible] کاشف [illegible]، کراچی

"دستک" کا انتظار تھا سو وہ بالآخر مل گیا۔ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی اس لئے کہ رسالہ توقع سے زیادہ اچھا ہے۔ کم از کم گیٹ اپ اور طباعت اور ادارت کی خوبیوں نے خاص دلکشی

پیدا کر دی ہے۔ اب رہا معاملہ معیار کا تو اس کی بڑی ذمہ داری تو معاصر اہلِ قلم پر آتی ہے۔ بہر حال اندازہ ہوتا ہے کہ دستک، ہم عصر تخلیقی میلان و معیار کا آئینہ دار ہے ـــــ این ہم غنیمت است، رسالہ کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کر رہا ہوں۔

● علیم اللہ حالی، گیا

کل کی ڈاک سے مجھے آپ کا رسالہ "دستک" ملا۔ جس کے لئے میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کو ایسا عمدہ پرچہ نکالنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے اس کا انداز بہت پسند آیا، اور امید رکھتا ہوں کہ یہ باقاعدگی سے نکلتا رہے گا۔

میں نے ابھی تک رسالہ کی محض ورق گردانی کی ہے، جس کے دوران میری نظر سے نجمہ کامران کی غزل گزری، یہ کل کی بات ہے مگر اس کا سرور آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔ انہیں میری طرف سے مبارکباد پہنچا دیں۔

● منیر الدین احمد، جرمنی

سہ ماہی "دستک" دیکھا۔ آپ نے پرچے پر بڑی محنت کی ہے۔ میرا خیال ہے اس کا معیار آنے والے دنوں میں مزید بلند ہوگا۔

● ممتاز احمد خان، کراچی

رسالے پر رائے کا یہ ہے کہ محض ایک شمارہ پڑھ کر رائے قائم تو کی جا سکتی ہے، دی نہیں جا سکتی۔ تاہم اتنا تو اب بھی کہہ سکتا ہوں کہ پرچے نے اچھا تاثر چھوڑا ہے، بلکہ جو چھوڑا ہے وہ تاثر سے زیادہ ہے، اور اچھا تو ہے ہی ـــــ باقی آئندہ۔ ایک مشورہ۔ ضروری نہیں کہ آپ بھی سب کی طرح قارئین کی آراء پر مشتمل کسی مستقل کالم کا پرچے پر بار ڈالیں۔ یہ چیزیں بیکار ہوتی ہیں ہم میں سے ہر کوئی بقراطِ ادب بن کر کچھ نہ کچھ ارشاد فرمانے لگتا ہے۔ اگر ایسا کالم رکھیں بھی تو اس کا عنوان رکھیں "فضولیات" یا "بقراطیات"۔ بقیہ پھر کبھی سہی۔ یہ غور طلب مشورہ ہے۔

● شجاع خاور، دہلی

"دستک" ملا۔ آپ نے بڑی محنت سے پرچہ مرتب کیا ہے۔ صوری و معنوی دونوں طرح متاثر کرتا ہے۔

● رشید امجد، راولپنڈی

رسالہ بہت اچھا ہے۔ سرورق بہت ہی خوبصورت ہے۔ دیپا مجھے کوثر آزاد صاحب
کے مضمون میں زیادہ دلچسپی تھی کیونکہ میں نے زمانۂ طالب علمی میں ایکل مدھوسودن کے بارے میں تھوڑا
بہت پڑھا اور سنا تھا۔ اب ادھر مدتوں سے ایکل مدھوسودن اور تورو دت کی شاعری ذہن پر سے
گویا اتر چکی ہے۔ میں نے اکثر سنا کہ ایکل اور تورو دت، دونوں ہی بلند پایہ شاعر تھے۔ افسوس کہ
انگریزی دنیا میں لوگ ان سے آشنا نہیں۔ اگر انہوں نے بنگلہ میں کام کیا ہوتا تو ادبی تاریخ کے
اچھے مصنفین ان کی ترجمانی پر شکر گزار ہوتے۔ ویسے مضمون میں یہی احباب کو علیحدہ کرنا ناانصافی ہے
حضرت میر نادریا کے پیر اپنے کو حق کا ایک پیر ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اپنے کو یہاں اس طرح نہیں لکھتے جیسے
مسلمان حضرات اپنے کو "مؤمن" کہنے پر زور نہیں دیتے ہیں۔

رشانتی رنجن بھٹاچاریہ کا مضمون بھی بہت اچھا ہے۔ یہ آپ نے کہیں سے ترجمہ کرایا ہے یا
خود انہوں نے اردو ہی میں آپ کو عنایت فرمایا۔ یہ جناب بعض لوگ برا نہیں مگر یہ اتنی راسخ
میں تو پورے تجربے کا ... ایک مضمون قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے مضامین تو
آپ کو دوسرے اردو کے رسالوں کے درمیان میں ایک بلند اور ممتاز جگہ دلا دیں گے۔

● قیصر تمکین، برطانیہ

"دستک" پہلا شمارہ ملا۔ پرچہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ معیاری بھی ہے
خدا کرے زورِ قلم رہے۔

● صبا اکرام، کراچی

دستک نظر نواز ہوا۔ سرزمین بنگال سے اور ادبی معیاری رسالہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔
از اول تا آخر پڑھا۔ لطف اندوز ہوئی۔ اور آپ کی ہمت کی داد دی۔ خدا کرے یہ پرچہ اپنے معیار میں
ہمیشہ ترقی پذیر رہے۔ اور منصب میں کامیاب ہو۔ مشمولات کی حیثیت ادبی ہے اور پرچے کا مزاج متوازن
اور سنجیدہ۔

حصۂ مضامین میں، ممتاز اسد خان کا ایک باب برکاتی ہے۔ تجزیہ۔ وزیر آغا کا منظوم ... کی
غزل، اور "گیان چند کا "منٹو اور عریانی"، اچھے مضامین کے زمرے میں آتے ہیں۔ افسانے کچھ مبتدیانہ
سے معلوم ہوئے، البتہ بنگلہ افسانے۔ وجود نامعلوم (ترجمہ حیدر جعفری سید) کی اٹھان اچھی معلوم ہوئی
افسانے کا تقسیم اور اندازِ تحریر منفرد ہے اور اس لئے چونکاتا ہے۔ انجام ذرا مضحکہ خیز معلوم ہوا۔
لیکن شاید یہی افسانہ نگار کا منشا ہے۔ نظمیں زیادہ تر درمیانی درجے کی ہیں۔ جن چند نظموں نے

متوجہ کیا۔ ان میں وزیر آغا کی "یہی اپنا ٹھکانہ ہے" صبا اکرام کی "آشیاں ڈھونڈتا ہے"۔ سلیم شہزاد کی "عکس" اور زاہدہ کی "وقت کی سرحدوں سے" کسی حد تک متاثر کرتی ہیں۔ غزلیات میں سے کئی اشعار نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ حالاں کہ آج کل زیادہ تر ادبی رسائل میں غزلوں کی یکسانیت حیرت انگیز ہے۔ اپنے مزاج، ڈکشن، امیجری اور استعارات، ہر لحاظ سے، وہ نظم ہو یا غزل جس حد تک فنکار اپنے ذاتی تجربے اور باطنی سچائیوں سے رشتہ استوار کرتا ہے اسی حد تک، اس کے فن میں انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ غزلوں کے جن اشعار نے خاص طور پر متاثر کیا وہ :

سر بسر تصویر آشوب ہنر کر دے مجھے
زندگی بس ایک حرف معتبر کر دے مجھے — فنا ابن فیضی

یہ ہوا کہ تیرے خیال نے مرا دل سرور سے بھر دیا
شب ہجر میں ترے درد نے مرا سینہ نور سے بھر دیا — مظفر حنفی
(یہ پوری غزل اپنے لہجے کے اعتبار سے پسند آئی)

دیار جاں پر ہوئے ہیں نازل عذاب کیسے
تری خموشی سے مل رہے ہیں جواب کیسے — ماجد الباقری

سیاست میں ماہر تھا دشمن میرا
مجھے تیغ دے کر سر لے گیا — محسن زیدی

اب مرے پاؤں کے نیچے ہے سلگتی ہوئی ریت
جو یہاں چھوڑ گئی موج کسی طغیانی کی — ممتاز راشد

حصار دید میں جاگا طلسم بینائی
ذرا جو لو تری شمع بدن کی تھرائی — عبدالاحد ساز

ریت ہے ذات کے صحراؤں کی نم
ہے روایت کہ یہاں قلزم تھے — عبدالاحد ساز

ہاں مگر اوک سے پینے کا مزاج
ورنہ ساغر تھے، سبو تھے، خم تھے — عبدالاحد ساز۔ کیا تیکھا انداز ہے

ترے جادوں کی رسائی کتنی بلیغ ہے آزما
پھر بھی تیرا طالب دیدار ہوا تھا ہوگا — شان بھارتی

زندگی میں نے تری ایک نئی راہ دیکھ لی

آج پھر ڈھونڈ رہا ہوں جسے ہر سو شب — بشیر وارثی

یہ کہہ کر خود کو سمجھاتا رہا ہوں

کہ سورج بھی تو تنہا ڈوبتا ہے — نعمان شوق، اس ایک شعر نے پوری غزل کو اٹھا لیا

ایک پرچے میں اتنی تعداد میں خوبصورت اشعار نکل آنا بھی بہت امید افزا بات ہے جن میں سے کئی اشعار نسبتاً نوجوان شعراء کے بھی ہیں۔

ایک بار پھر آپ کو ایک معیاری پرچہ نکالنے پر مبارکباد دیتی ہوں۔ پرچے کی کتابت بلا شبہ معیاری ہے اور گیٹ اپ میں آپ لوگوں کے جمالیاتی ذوق کا پرتو ہے۔

● ساجدہ زیدی، علی گڑھ

احمد سلیم کے سرورق سے لے کر تیسیر شمیم کے تبصرے تک، ہر چیز اپنی جگہ خوب ہے، ماسوا چند فرو گذاشتوں کے جو عام طور پر پہلے شمارے میں ہوتی ہیں۔ غزلیں سب ایک سے ایک ہیں نظمیں البتہ دو چار کمزور ہیں۔ احمد سلیم کا ثقافتی مضمون بہت اہم ہے۔

● اقبال کرشن، کلکتہ

"ایک انتظار کے بعد 'دستک' سنائی دی"۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے ہی شمارے نے عصری اردو ادب کے اعلیٰ معیار پر قبضہ جما لیا ہے، لیکن یقیناً آپ اس کو حرف آخر نہ سمجھتے ہوں گے، مجھے بھی امید ہے کہ پرچہ مزید نکھرے گا، نکھارا جا سکتا ہے۔

میری دو نظموں میں کتابت کی تین غلطیاں پائی گئی ہیں۔ "جون" کو "جرن" (نظم صورتحال) "اس بعید" کو "اس بعید" اور "میں نے دیوار پر" کو "دیواروں پر" (نظم ...) لکھ کر کاتب نے اپنے ستم ظریف ہونے کا اعلان کر دیا ہے (یہ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں)

● سلیم شہزاد، مالیگاؤں

ادبی رسائل و جرائد کے دروازے پر آپ کی یہ پہلی "دستک" ہی توجہ کرنے والی ہے جو نکالنے والی ہے۔ آپ نے بڑی محنت سے رسالہ کو ترتیب دیا ہے۔ آپ چاہیں تو ۱۷ مارچ کی رات (ایک بجے) آل انڈیا ریڈیو کے اردو سروس سے اس "دستک" کی گونج سن سکتے ہیں۔ جی ہاں میں نے آپ کے رسالے پر بہت مفصل اور بھرپور تبصرہ ریڈیو پر کیا ہے لیکن وہ تو دنیا داری تھی، حقیقت یہی ہے کہ یہ رسالہ (ذرا کڑے الفاظ مناسب، کہنا ٹھیک نہیں) سر اٹھا رہا ہے) اپنے اندر تمام تر ارتقائی امکانا

چند گیان کی باتیں بھی کی ہیں لیکن وہ سب عریانی کے تعلق سے ہیں۔ راقم الحروف کا ذہن چونکہ مولویانہ ہے اس لئے اگر بات ستر پوشی سے شروع ہوتی تو زیادہ راس آتی۔

ستر پوشی ہی کی بات چل نکلی ہے تو دیہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے قلمکاروں کے نہ صرف پتے شائع کئے ہیں بلکہ ان کی تصویریں بھی۔ پتے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری اور قلمکار سے راست رابطے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اکثر مدیران قارئین و قلمکاران کا یہ حق بھی غصب کر لیتے ہیں اور ظالم بچولیے کی طرح درمیان میں حائل ہو جاتے ہیں۔ تصاویر میں شفق سہسرامی کو بھی دیکھا اور وزیر آغا کو بھی دیکھا اور جھٹ منہ سے واللہ احسن الخالقین کی صدا بلند ہوئی۔ قیصر شمیم غالباً وزیر آغا کی تصویر دیکھ کر ہی خدا سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ تصاویر کچھ مستورات کی بھی ہیں اور نام سے بظاہر یہ مسلم خواتین کی تصاویر ہیں، لیکن اب کیا پتہ؟ ان دنوں ایک شعبہ "کلچرل مسلم" کا بھی ظہور میں آیا ہے۔

نظموں میں غلام حسین ساجد اور قیصر شمیم کی تخلیقات متوازن فکر و نظر کی غماز ہیں۔ حمید الماس اور خلیل تنویر نے بھی مایوس نہیں کیا۔

احمد سلیم کا ثقافتی مضمون "ہندوستانی رقص" معلومات افزا ہے۔ یہ مضمون تقابلی امتحانات کے طلبہ کے لئے بھی کار آمد ثابت ہوگا۔

آنجہانی شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا مضمون قیمتی ہے اور آنجہانی بھٹاچاریہ پر محمد سلیمان خورشید کا مضمون فرض شناسی کی اچھی مثال۔

غزلیات میں سردار طائفہ حضرت فضا ابن فیضی نے فی الواقع شاعری کو ایک عبادت کی طرح برتا ہے مظفر حنفی اپنے مانوس لہجے کے ساتھ حاضر ہیں۔ البتہ رفتار زمانہ سے غالباً کچھ سہمے سہمے معلوم ہوتے ہیں ورنہ انھیں اجازت کی ضرورت نہ ہوتی ہے

تیر کھائے ہیں مظفر نے تمہارے ہاتھوں ‏ ‏ ‏ اب تمہیں شعروں سے تڑپائیں، اجازت ہو تو

کرشن موہن کا یہ مصرعہ " زمانے میں شہرہ ہوا خوب اپنا " متقاضی ہے کہ اس پر بلا چوں و چرا صاد کیا جائے اور اس کے بعد کی غزلیں بخدا میں نے نہیں پڑھیں۔ حسن ظن ہے کہ اچھی ہی ہوں گی۔

افسانے سب کے سب بور کرنے والے ہیں اور Readablity کی خصوصیت سے محروم۔ اس میں قصور آپ کا بھی نہیں۔ ہندوستانی مال پر تو غالباً آپ خود مشکوک تھے۔ اسی لئے دو افسانے " درآمدہ " بھی پیش کئے لیکن وہ بھی سنبھالا نہ دے سکے۔

انشائیہ غنیمت اور تبصرے عادلانہ ہیں۔

مجموعی طور پر رسالہ "ایک معیاری" رسالہ ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ البتہ تنقید اور توجہ کا فقدان ہے۔ کاغذ قدرے بہتر استعمال کیجیے۔ انتخاب اور سختی ہونا چاہیئے اور احساس کمتری کو دبا دینے ہی میں بھلائی ہے۔ میں ادبی آنگن میں دیوار کھڑی کرنے کا تو قائل نہیں لیکن "حفظ مراتب" کو ضرور پیش نگاہ رکھیئے۔ بہتر ہوگا قائل ہوں۔

● نازنین جمیل پوری، رانی گنج

دستک "کا پہلا شمارہ ملا۔ ہونہار برواکے چکنے چکنے پات (سرورق کی چکناہٹ بھی اسی میں شامل ہے) ۔ اٹھان اچھی ہے۔ اس لئے مبارکباد! لیکن خوب سے خوب تر کی لگن ہمیشہ بنی رہنی چاہیئے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے مظفر حنفی کی غزل پر عمدہ مضمون لکھا ہے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا مضمون "بنگال کے چند کتب خانوں میں محفوظ اردو مخطوطات" میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے۔ شہزاد منظر کے مضمون نے مائیکل مدھوسودن دت سے ایک اچھی ملاقات کرا دی ہے۔ "ہندوستانی رقص" "بھاؤ"، "راگ"، اور "تال کی لے پر" احمد سلیم کا یہ خوبصورت مضمون میری معلومات میں اضافے کا باعث بنا ہے۔ بس ان کے اس جملے پر مجھے تھوڑا سا رکنا پڑا۔

"ہندوستانی رقص کی روحانیت، اور اس کے تقدس پر غور کیا جائے تو یہی کہا جائے گا کہ رقص کی ایک ہی قسم ہے اور وہ ہے جوگی کی سمادھی جس میں جسم ہر طرح ساکت رہتا ہے جب کہ جسم کی دوسری حرکات، اس روحانی کیفیت کی نفی کرتی ہیں" جوگی کی سمادھی بھی یقیناً رقص کا ایک انداز ہے لیکن طواف بھی رقص کی ہی ایک صورت ہے جس میں روحانی کیفیت، اور تقدس موجود ہیں۔ خانہ کعبہ کا طواف، اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ یاد رہے کہ اسلام سے پہلے بھی خانہ کعبہ کے گرد اسی طرح طواف کیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس طواف کے دوران وحدت، خداوندی کا ورد اپنا لیا۔ مظفر حنفی، شان بھارتی، بشیر فاروقی اور اقبال متین کی غزلیں زیادہ اچھی لگیں۔ میرا خیال ہے کہ جدید غزل اب علم کے مصنوعی اور بوجھل اظہار سے نجات پا کر، فکر اور جذبے کی ہم آہنگی کے ساتھ ابھر آئی ہے، اس غزل کے مقابلے میں فیشن زدہ جدیدیت والی بیوست زدہ غزل اب دم توڑ رہی ہے۔ جدید شاعری کی طرح اب جدید افسانہ بھی بے راہ روی سے نجات پا رہا ہے۔ حیدر جعفری سیّد کا بنگلہ سے ترجمہ افسانہ "وجہ نامعلوم" اپنی ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے اچھا لگا لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ حیدر جعفری سیّد نے اپنے بنگلہ افسانہ کا ترجمہ کیا ہے یا کسی اور بنگلہ افسانہ نگار کے افسانے کا ..... یہ وضاحت بھی ساتھ ہوتی تو اچھا تھا۔

● حیدر قریشی، جرمنی

"دستک" نظر نواز ہوا۔ انتہائی دقیع اور بےحد خوبصورت ہے۔ میری غزلوں کے تعلق سے کافی خطوط مجھے ملے۔ یہ دستک کی مقبولیت کی علامت ہے۔

● ممتاز راشد، بمبئی

آپ کا ارسال کردہ "دستک" کا اوّلین شمارہ موصول ہوا۔ آپ نے بڑی محنت کے ساتھ بڑی حد تک معیاری اور متنوع ادبی مواد یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

● ذکاء الدین شایاں، پیلی بھیت

خط اور رسالہ ملا۔ شکریہ! اتنا خوبصورت، صوری اور معنوی دونوں حیثیت سے رسالہ نکالنے پر میری مبارکباد قبول کرو، رسالہ وارث علوی کی زبان میں واقعی چمکدار پرچہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ یہ چمک اور حسن برقرار رکھیں گے، غزلوں کے ضمن میں شعرا کی ترتیب میں مجھے ذرا سا اختلاف ہے لیکن میں ایڈیٹر کو یہ پورا حق دیتا ہوں کہ وہ جسے جہاں چاہے جگہ دے، اس کی نظر نام کی بجائے تخلیق پر ہونی چاہیے۔ اور آپ اس کسوٹی پر پورا اترتے ہیں، زندہ باد!

● کوشل کمار ٹھاکر، ہماچل پردیش

دستک کا پہلا شمارہ مل گیا۔ اس کرم فرمائی کے لئے شکرگذار ہوں۔

آپ نے ہر لحاظ سے دستک کو ایک قابلِ قدر رسالہ بنانے کی کوشش کی ہے اور آپ اس میں کامیاب رہے ہیں۔ مبارکباد۔

● حمید الماس، بنگلور

"دستک" کا پہلا شمارہ موصول ہوا، شکریہ! رسالہ واقعی خوبصورت ہے۔ میری طرف سے دلی مبارکباد ....

ترتیب و تزئین میں آپ نے اپنی جمالیاتی حس کا ثبوت دیا ہے۔ سب سے اچھی بات مجھے یہ لگی کہ آپ نے ہر شاعر کو الگ صفحہ عنایت کیا ہے اور دو شاعروں کی نگارشات ایک ہی صفحہ پر گڈمڈ نہیں کیں۔ اس سے رسالہ کا حسن بڑھ گیا اور فن کار کی وقعت بھی۔ شعری حصہ خاص طور پر پسند آیا۔ نجمہ کامران کی غزل میں بہت درد ہے۔ خلیل تنویر، حمید الماس اور منظر حنفی کی تخلیقات متاثر کرتی ہیں، لیکن گیان چند کے مضمون نے طبیعت مکدر کر دی۔ یہ ٹیبل ٹاک سے زیادہ نہیں ہے۔ خود گیان چند لکھتے ہیں کہ یہ ان کا میدان نہیں ہے۔ میرے بھائی اگر میدان نہیں ہے تو کیوں طبع آزمائی کرتے ہو؟ کیا ضرورت ہے اتنا لچر اور سطحی مضمون لکھنے کی .... آج کے قاری کو آپ بہلا نہیں سکتے .... وہ تنقید میں بھی تخلیق کے جوہر

تلاشتا ہے۔

● شموئل احمد، پٹنہ

"دستک" دیکھا جی خوش ہوگیا۔ بڑا ہی خوبصورت رسالہ ہے۔ آپ نے تو معجزہ کر دکھایا۔ خدا کرے یہ رسالہ جاری رہے۔

● بیگ احساس، حیدرآباد

سہ ماہی دستک کا پہلا شمارہ ملا۔ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ اردو میں اب ایسے رسالے خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔

عموماً اردو رسالے میں کچھ غزلیں، کچھ نظمیں اور دو تین افسانے اور ایک آدھ تنقیدی مضمون ہوتا ہے آپ نے اس روایت سے انحراف کر کے ایک حوصلہ مندانہ قدم اٹھایا ہے۔

ہندوستانی رقص، بھاؤ، راگ، اور تال کی لے پر، احمد سلیم کا مضمون معلوماتی ہے ثقافت پر مضامین کا سلسلہ جاری رکھئے۔

اردو والے اپنے محسنوں کو یاد نہیں کرتے۔ آپ نے شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی یاد میں کچھ صفحات دے کر ایک اہم کام کیا ہے۔

● خلیل تنویر، اودے پور

"دستک" کا پہلا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس معیاری جریدے کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ "نام نہاد ادبی" پرچوں کی بھرمار میں سچ مچ ادبی پرچہ نکالنا [گھاٹے] اور نقصان کا سودا ہے۔ مگر نفع نقصان کاروبار کی اصطلاحیں ہیں، ادب میں ان کے کوئی معنی نہیں۔ رہی بات، ادبی پرچہ کے اخراجات کی تو یہ کوئی ناقابلِ حل مسئلہ نہیں ہے۔ کم تعداد میں ہی ہی لیکن معیاری ادب کے لئے خرچ کرنے والے آج بھی موجود ہیں۔ بس شرط ہے دلچسپی، استقلال اور معیار۔ ورنہ ہوتا یہ ہے کہ پرچے کی اشاعت بڑھانے، اسے خواہ مخواہ مقبول عام بنانے کے چکر میں ادبی پرچے غیر ادبی مواد پر اتر آتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔ اصل میں ادب میں سمجھوتہ قسم کی کوئی شئے نہیں ہوسکتی۔ ادب یا تو ادب، ہوتا ہے یا پھر غیر ادب۔ ذوق کی (ت) ینا المزل چیز ہے اسے ظاہری قیمتوں سے آنکنے کی غلطی اچھے خاصے معیاری پرچوں کو بھی عام بنا دیتی ہے۔

اس شمارے میں سب ہی مندرجات اہم ہیں مگر انیس رفیع صاحب، کا فرات، پر تبصرہ اہم ترین ہے۔ یہ تبصرہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ جب، فنکار فن کے بارے میں اظہار رائے کرتا ہے تو بہت سے نقادوں کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نظر آسکتی ہیں۔ انیس رفیع صاحب، کیوں کہ خود بھی ایک بلند پایہ افسانہ نگار

اس لئے تبصرہ بھی تخلیقی اہمیت کا حامل ہے۔ اس تبصرے کو پڑھ کر مجھے ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں قرات کے سلسلے میں جو خط حسین الحق صاحب کو لکھنے والا تھا اس سے بچ گیا کیوں کہ بعینہ یہی رائے میں بھی لکھتا۔

● انجم عثمانی، نئی دہلی

"دستک" کا پہلا شمارہ ہی اتنا دلآویز ہے کہ بے ساختہ زبان سے "ماشاءاللہ" نکلا "چشم بد دور"۔ آپ، کابریوں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اتنا بھرپور پرچہ پڑھ کر قاری یقیناً مطمئن ہوگا اور صرف بتیس روپے میں! ایک ایک مضمون اپنی جگہ منفرد، اور پھر کیسے کیسے جید لوگوں کو جمع کر رکھا ہے۔ گیان چند جین صاحب، (منٹو اور عریانی) کے کیا کہنے۔ انہیں تو اچھے سے اچھا لکھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے اور ہمیں بھی الا بلا ہضم نہیں ہوتا ہے

اک یہی بات، ترے پاس مجھے لاتی ہے
خوش مذاقی تری خوبی، مری کمزوری ہے

منٹو پر آج تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو جین صاحب نے بڑے سلیقے سے سم اپ کرتے ہوئے اپنی بے لاگ رائے دی (جیسے اردو کے ارتقا میں ان کا دو ٹوک، مگر مدلل نظریہ ہے۔)

ڈاکٹر وزیر آغا جیسے قد آور ناقد نے پردیپ مظفر حنفی جیسے بلند قامت فن کار کی چند ایک غزلوں کی روشنی میں ان کی فکر کا جائزہ لینے کی مستحسن کوشش کی۔ دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ مسلم الثبوت حیثیتوں کے مالک۔ آغا صاحب کی رائے اخلاص پر مبنی ہے۔

نصیر الدین احمد صاحب نے نثری نظم کی حمایت میں مضمون کے آخر میں بڑی اہم بات کہی کہ سہل ممتنع (جس کی مزید نثر ممکن نہ ہو) ہی کو شعر کی معراج سمجھا جائے تو پھر نثری نظم تو یہ فریضہ بخوبی ادا کر سکتی ہے' ان کے سارے دلائل کے باوجود یہ صنف "نہ تینوں میں نہ تیروں میں" ہی لگتی ہے۔ اپنا اپنا مذاق ہے۔

مائیکل مدھوسودن دت پر شہزاد منظر صاحب نے اتنے خوبصورت انداز میں لکھا کہ مالک رام سے غالب کی ملاقات (وہ صورتیں الٰہی...) جیسا مزہ آگیا ہے۔ ممتاز احمد خاں صاحب کا "ایک باپ بکاؤ ہے" کا تجزیہ پڑھ کر بیدی کی نہ صرف کہانی تازہ ہو گئی بلکہ ان کے اسلوب کی تازہ کاری بھی مزہ دے گئی۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی صاحب نے "بیدی نامہ" میں انہیں ایک موجد فن کار ثابت کیا ہے۔ اس کہانی ہی کی طرح یہ مضمون بہت دلچسپ ہے۔

بھائی سچ تو یہ ہے کہ آپ کے دستاویزی حیثیت کے حامل رسالے کی جان تو آنجہانی شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا مضمون "بنگال کے چند کتب خانوں میں محفوظ اردو مخطوطات" ہے۔ تنہا آدمی نے ٹیم ورک،

ادا کیا ہے۔ آنجہانی پر سلیمان خورشید کا مضمون بھی بروقت خراج ہے۔ افسوس کہ ایسی قد آور شخصیت،
حیدرآباد میں رہی اور ہم اس سے نیاز حاصل کرنے سے محروم رہے۔

جناب فضا ابن فیضی اور پروفیسر مظفر حنفی کے قلم خدا کرے کبھی نہ تھکیں۔ دونوں حضرات ہی اور سنگلاخ زمینوں میں پھول کھلانے کے ماہر ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ !

● رؤف خیر، حیدرآباد

دستک، کا تازہ شمارہ زیرِ نظر ہے۔ رسالہ ادارت کی صلاحیتوں اور قلمکار کی بہترین تخلیقات، سے مزین ہے۔ نثری اور شعری، دونوں حصوں کا انتخاب بہت خوبصورت ہے۔ سبھی مضامین ابھی پڑھوں گا۔ مگر زاہدہ زیدی، صبا اکرام اور اشہر ہاشمی کی نظمیں، محسن زیدی، مظفر حنفی، شان بھارتی اور شاہد کلیم کی غزلیں بے حد پسند آئیں۔

الیاس احمد گدی نے 'خود سوختگی' جیسے خونِ جگر میں انگلیاں ڈبو کر لکھا ہے تبھی تو ایسا بھرپور تاثر ہے۔ اس قدر خوبصورت رسالہ نکالنے کیلئے مبارکباد قبول کریں۔ خاص طور سے آپ کے فنِ انتخاب کی داد دے رہا ہوں۔

● شفیع منیر، پٹنہ

"دستک" کا پہلا شمارہ ملا۔ "دیر آید درست آید" کے مصداق دستک از اول تا آخر ایک اچھا رسالہ ہے جو کہ صوری و معنوی خوبیوں سے مزین ہے۔

مضامین اور دوسرے شمولات معیاری ہیں اور معیاری لکھنے والوں کے نام اس رسالہ کی دیرپا زندگی کی ضمانت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نقشِ اول ہے نقشِ ثانی اس سے بہتر ہوگا۔

خدا سے دعا ہے کہ آپ کا یہ رسالہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

● خورشید نعمان رورلیو، [illegible]

آپ کی اس ادبی کاوش میں مستقبل کے لئے بہت روشن امکانات مضمر ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ آپ اپنے مشن میں کامیاب ہوں۔ آپ کے پاس نظر ہے۔ امید کرتا ہوں کہ حالات آپ کے حق میں سازگار رہیں گے۔ اور دستک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے گا۔

● غضنفر پریہار، لدھیانہ

"دستک" نے پہلے ہی شمارے سے ہندو پاک کے معیاری و سنجیدہ قارئین اور ادبی حلقوں کو متوجہ کر لیا ہے۔ دستک کا شمارہ جب ہاتھ میں آیا تو اسے ایک نظر دیکھتے ہوئے اور سرسری ورق گردانی

کرتے ہوئے ہی دل میں شہد سا گھل گیا تھا۔ پھر اطمینان سے انہماک کے ساتھ پڑھا تو واقعی تسکین باطنی کا احساس ہوا۔ توصیف میں کچھ بھی کہوں تو رسمی سا معلوم ہو، مجھے پوری امید اور یقین ہے کہ اگلے ایک دو ہی شماروں میں یہ ملک کے فائق اور سر فہرست رسالوں شلاً ذہن جدید سوغات وغیرہ کے ہم پلہ ہو جائے گا۔ آپ کی محنت اور صلاحیت واقعی ثمر آور ہے۔

● شبا۔ الاحد ساز، بمبئی

ایک خوبصورت رسالے سے روشناس کرانے کے لئے بہت بہت شکریہ!

تمام مضامین بہت اچھے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی جو تاثر ابھرا اس کے بعد صرف یہ دعا ہی کر سکتی کہ خدا کرے کہ رسالہ باقاعدگی سے نکل سکے۔ عموماً اتنے اچھے پرچے چل نہیں پاتے۔ یہ شاید ہم اردو والوں کی بدقسمتی ہے۔ بہرحال میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں اور ہر ممکن تعاون کیلئے حاضر ہوں۔

● ذکیہ مشہدی، پٹنہ

آپ کا رسالہ "دستک" بے حد پسند آیا۔ آپ نے اسے بڑی محنت اور لگن سے شائع کیا ہے اچھے مضامین، نظمیں، اور غزلیں عمدہ۔ کاغذ، کتابت، طباعت، دیدہ زیب۔ مبارک ہو۔

● تاج پیامی، آرہ

نیا سال کا تحفہ "دستک" کے روپ میں موصول ہوا۔ صوری اور معنوی اعتبار سے پرچہ بیحد پسند آیا۔ ویسے کچھ چیزیں بھرتی کے طور بھی شامل ہو گئی ہیں اور شاید یہ پہلا شمارہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ امید ہے تخلیقات کے انتخاب میں کچھ اور سختی سے کام لیں گے۔

● شاہد کلیم، آرہ

"دستک" کا پہلا شمارہ ملا۔ اس گراں قدر تحفے کا بہت بہت شکریہ! بیحد عمدہ رسالہ نکالا آپ نے۔ اس کی شمولات بھی معیاری ہیں اور اس کا گٹ اپ بھی شاندار ہے۔ ہر ہر ورق پر آپ کے سلیقے کی مہر ثبت ہے۔ ادبی رسالے اتنے خوبصورت کم ہی نکلتے ہیں۔ خدا اس حسین و نفیس رسالے کو طویل زندگی عطا کرے۔

● اختر بستوی، گورکھپور

"دستک" کا افتتاحی شمارہ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ بہت خوبصورت، ترتیب و تزئین کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ رسالہ جس صحت مند سوچ کے ساتھ ابھر کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ کاش ادب کا دم بھرنے والے ادیب و فنکار بھی اگر واقعی چاہ لیں تو یہ رسالہ زندہ رہ سکتا ہے۔ معذرت کے ساتھ

کہنا چاہتا ہوں کہ زیادہ تر اردو کے اساتذہ جن کے چولہے اور شکم کا رشتہ اردو سے ہے، وہ بھی اس حد تک بے حسی کے شکار ہیں کہ ایسے سنجیدہ رسالے کے خریدار نہیں ہیں۔ دنیا کی ہر مقبول زبانیں تب تک ہی زندہ ہیں جب تک انہیں تحریک کی شکل میں لیا جاتا رہے گا۔ اردو بھی ایک تحریک کا نام ہے۔ عنبر شمیم صاحب آپ نے ایک عمدہ کوشش کی ہے لیکن اردو کے بہت سارے افیون زدہ نام نہاد علمبرداروں کے اذہان کو بھی عملی طور پر صحیح سمت میں جانے کے لئے بیدار کرنا ہوگا۔

● قاسم خورشید، پٹنہ

"دستک" کا پہلا شمارہ ملا، بے حد شکریہ! ۲۰۸ صفحے کا یہ رسالہ ہر لحاظ سے معیاری، قابل توجہ اور قابل استفادہ ہے۔ پہلے ہی شمارہ سے آپ نے دل و دماغ کو کھینچ لیا ہے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ اس کی درازیٔ حیات کے لئے دعا گو ہیں۔

● مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

سہ ماہی "دستک" کا پہلا شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ "دستک" نے در دل پر ایسی بھرپور دستک دی کہ اسے بے اختیار نہاں خانۂ دل میں چھپا لینے کا دل چاہا مگر دستک چونکہ پرایا تھا اس لئے حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جتنا وقت ملا دستک سے فیض اٹھاتا رہا۔ دستک کی کتابت، طباعت، اور ترتیب و تزئین نے بہت متاثر کیا۔

آپ کی کوششیں قابلِ صد ستائش ہیں۔ میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

● سید معراج جامی، کراچی

آپ کے چار سال قبل کے خواب کی سنہری تعبیر "دستک" کی صورت میں دیکھ کر مسرت ہوئی۔ دستک کی پہلی آواز (شمارہ ۱) ہی اردو دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ مبارک ہو۔ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے واقعی آپ نے اردو کی روایتی ادبی صحافت کو ایک تبدیلی کا رخ دکھایا ہے۔

● عطا عابدی، دہلی

"دستک" ایک سہ ماہی رسالہ عنبر شمیم کی کاوشوں کا دیدہ زیب نتیجہ ہے۔ کلکتہ جیسے علم و ادب کے دیار نے مختلف ادبی جریدوں کے ذریعے مشہور ادبی شخصیتوں کو منظر عام پر لانے میں جو کارنامہ انجام دیا ہے اس سے ادب کی تاریخ پر نئے انداز سے روشنی پڑتی ہے۔ اسے صنفی اعتبار سے مختلف حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ نثری تخلیقات میں ترتیب و تنظیم کے علاوہ افادیت کا خیال رکھا گیا ہے۔ میرے کہنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ عام طور پر ادبی جریدوں کی اشاعت میں افادیت کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ ہمیشہ تر

ادبی تخلیقات، افادیت سے مملو ہوتی ہیں لیکن اس ادبی رسالے کے شمارہ نمبر ۱ کی خصوصیت یہ ہے کہ مستند قلم کاروں کو جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً گیان چند جین، وزیر آغا، زاہدہ زیدی، مظفر حنفی، شہزاد منظر، حمید الیاس، اشہر ہاشمی، فضا ابن فیضی، نشتر خانقاہی، عشرت قادری، رؤف خیر، مسعود سبزواری، شان بھارتی، اقبال متین، خلیل تنویر، خالق عبداللہ اور دوسرے فنکاروں میں الیاس احمد گدی، شرون کمار ورما اور شفق کے افسانے مختلف عصری تقاضوں سے پُر ہیں۔

بعض ادبی شخصیتیں محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کے شہ پارے مختلف ادبی جریدوں میں جگمگاتے رہتے ہیں۔ مظفر حنفی (اقبال پروفیسر، کلکتہ یونیورسٹی) نے منثور و منظوم تخلیقات میں اپنا قابلِ تقلید مقام بنایا ہے، یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا جیسے مشہور و معروف نقاد نے ان کی تخلیقات کا محاسبہ کیا ہے۔ انیس رفیع کا تجزیہ "ذات" (معین الحق) سے متعلق قابلِ ستائش ہے۔ افسانے جو اس شمارے کی زینت ہیں لائقِ تحسین ہے۔ منظوم حصہ فکر و فن کی بلندی کی اہم پہچان ہے۔ نثری حصہ بھی اس رسالے کی اہمیت میں قابلِ تعریف رول ادا کرتا ہے۔ اگر تحقیقی مضامین کا اضافہ کر دیا جائے اور مختلف ادبی تحریکوں کے علاوہ ہندوستانی اور غیر ہندوستانی زبانوں کے ترجمے شامل کئے جائیں تو اس کی رونق میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اہم ادبی شخصیتوں کا تعارف ہر شمارہ میں یکے بعد دیگرے شامل ہو تو اس کی دیدہ زیبی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

● عبدالمنان، کلکتہ

بڑی محنت سے خوبصورت شمارہ نکالا ہے اور بڑے سلیقہ سے ترتیب دیا ہے۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ آپ نے ثقافت کا عنوان بھی رکھا ہے۔ یہ کالم بہت ضروری ہے، مجھے پسند آیا ہے۔ رسالہ دیکھ رہا ہوں۔ جلد ہی تفصیلی خط لکھوں گا۔

● علی احمد فاطمی، الہ آباد

پہلا شمارہ اور اتنا خوبصورت اور معیاری یقین نہیں آتا۔ رسالہ معنوی اور صوری حیثیت سے معیاری ہے تقریباً ساری تخلیقات بہترین اور معیاری ہیں۔ لکھنے والوں میں معتبر نام بھی ہیں جو رسالہ کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔ کن کن چیزوں کی تعریف کی جائے مضامین، نظمیں، غزلیں، افسانے، ترجمہ، انشائیہ، تبصرے سبھی آپ کے حسنِ انتخاب کے آئینہ دار ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادب کی خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم آپ میں موجود ہے اور یہی جذبہ ثابت قدمی کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت عطا فرمائے کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت شمارہ شائع کریں۔

● سہیل شاذ بیودی، کراچی

سہ ماہی " دستک " کے مطالعہ سے سرشار ہوا۔ بقول ڈان ٹامس " ایک اچھی نظم کائنات میں اضافہ ہوتی ہے " تو بلا شبہ ایک معیاری جریدہ اپنے ملک اور ملک کی ادبی تاریخ میں بے مثال اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں قطعی مبالغہ نہیں کہ " دستک " " تو قعات " سے کہیں زیادہ پرکشش، دلآویز اور معیاری ادبی مجلہ ہے۔ مغربی بنگال کی صحافتی دنیا میں اسے منفرد " میدارۂ نور " قرار دیا جا سکتا ہے۔ ترتیب و تزئین کے لحاظ سے یہ اتنا دیدہ زیب ہے کہ اس کی محض ورق گردانی بھی ایک خاص کیفیت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ مقالات گراں قدر، غزلیات تخلیقیت افروز، منظومات اقدار نو کی عکاس، افسانے مسائل حیات کے ترجمان اور تبصرے بیحد وقیع اور جاندار ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے منٹو کی عریاں نگاری کا سچا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا نے برادرم مظفر حنفی کی غزل کو تنقید کے بالکل نئے اور بصیرت افروز تناظرات میں پرکھا ہے اور تہہ دار معنویت سے روشناس کرایا ہے۔ اب مظفر صاحب کو ایسے شعر کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی ؎

منظفر آج بھی کچھ ناقدین عالی جاہ
فعول و فعلن و مفعول پر معلق ہیں

میں آپ کو اتنا خوبصورت، معیاری اور لائق مطالعہ ادبی جریدہ شائع کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ اسے زندہ رکھنے میں کامیاب ہوں تاکہ مغربی بنگال کی تاریخ کا رخ موڑ دینے کا کارنامہ بھی انجام پا سکے۔

● ظہیر غازیپوری، ہزاری باغ

آپ کی محبت اور عنایت ہے کہ " دستک " منظر نواز ہوا۔ مشمولات سے آپ کی پالیسی واضح نہیں ہوتی۔ شاید دو چار شماروں کے بعد آپ کھل کر سامنے آسکیں۔ کلکتہ کے اور اردو رسالوں کے مقابلہ میں بہت بہتر ہے۔

آپ کو نیا سال اور دستک مبارک ہو۔

● کامل اختر، کلکتہ

" دستک " نصیب ہوا۔ چشم بد دور، بہت ہی نظر نواز نکلا۔ سرورق سے لیکر کتابت تک! آپ کی محنت ٹھکانے لگی۔ دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

● بلقیس ظفیر الحسن، نئی دہلی

سہ ماہی " دستک " کا اولین شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ عصری ادب، کتاب نما، ذہن جدید اور اردو کے دیگر چند معیاری ادبی جریدوں میں " دستک " کا بھی شمار کیا جائے گا بلکہ بغیر کسی ذہنی تحفظ کے یہ کہا جا سکتا

ہے کہ یہ جریدہ آپ کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق اور ادبی صحافت کی انفرادیت کا غماز ہے۔ آپ نے بڑے فن کے ساتھ اردو دنیا کے معروف قلمکاروں کو یکجا کر دیا ہے۔ ترتیب و تدوین کے ساتھ کتابت، اور Lay Out میں کافی نفاست برتی ہے۔ میں آپ کو اس عظیم کارنامہ پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مشمولات میں آپ نے فن کاروں کے نام کے ساتھ ان کے واضح پتے بھی درج کئے ہیں۔ اگر جرمنی کے منیر الدین احمد، پاکستان کے ممتاز احمد خاں، بنگلور کے حمید الیاس، سلیم شہزاد، پاکستان کے ماجد الباقری کے نام کے ساتھ تفصیلی پتہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔

● حفیظ اللہ نول پوری، کٹک

سہ ماہی "دستک" کا پہلا شمارہ نظر نواز ہوا۔ مغربی بنگال سے سہ ماہی اردو رسالہ جاری کرنے والوں میں آپ کی حیثیت گرچہ ثانوی ہے مگر ہوڑہ کے تعلق سے آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سہ ماہی اردو رسالے کا اجرا کیا ہے۔ میری مبارکباد قبول فرمائیں۔

رسالہ ہر اعتبار سے بہتر ہے، اردو دنیا کی مایہ ناز ہستیوں کی تخلیقات کی شمولیت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کو ان کا قلمی تعاون مستقبل میں بھی حاصل ہو گا جو ایک رسالے کے وقار کو قائم رکھنے کیلئے ضروری ہے۔ محترم گیان چند کا مضمون "منٹو اور عریانی" نئی نسل کے قلم کاروں کے لئے معلومات فراہم کرتا ہے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ سے متعلق سلیمان خورشید کا مضمون شائع فرما کر آپ نے شانتی نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ موصوف کے مضمون سے شانتی بابو کے خاندانی اور نجی حالات سے بہت حد تک واقفیت ہوتی ہے۔ جناب وزیر آغا کا مضمون اور ان کا کلام دونوں کو شامل کیا گیا ہے، اسی طرح حضرت قیصر شمیم کا تبصرہ بھی ہے اور ان کی شعری تخلیق بھی۔ میری سمجھ سے ایک قلم کار کی ایک ہی چیز شامل ہو تو بہتر ہے۔ غزلوں کا انتخاب بہت خوب ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیادہ تر غزلیں ایک ہی مزاج کی ہیں، نظمیں بھی عمدہ ہیں۔ جناب منیر الدین احمد اپنے مضمون "نثری نظم کے حق میں" ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "آج نثری نظم منہ کا مزہ بدلنے کے لئے نہیں لکھی جا رہی ہے بلکہ اس لئے کہ بعض موضوعات پر انسان صرف نثری نظم لکھ سکتا ہے"۔

ان کے اس خیال سے میں متفق نہیں ہوں۔ اگر بعض موضوعات نثری نظم کے محتاج ہو سکتے ہیں تو پھر آزاد نظم کیوں وجود میں آئی ہے؟ ڈرامہ، لسانیات اور دوسرے موضوعات پر مشتمل تخلیقات پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

● انجم عظیم آبادی، کلکتہ

▼ رسالے کی مندرجات کمزور بلکہ خاصی کمزور ہیں۔

● ساقی فاروقی، لندن

▼ رسالہ آپ نے واقعی بڑا خوبصورت نکالا ہے لیکن بیشتر تخلیقات متاثر نہ کر سکیں۔ خاص طور سے غزلیں آپ نے اتنی وافر مقدار میں شائع کر دی ہیں لیکن ان کے انتخاب پر معقول توجہ نہیں دی یہاں تک کہ کئی لوگوں کی مطبوعہ تخلیقات بھی آپ نے شائع کر دی ہیں۔

● لقمان شوذر، آرہ

▼ نئے سال کا تحفہ "دستک" مل گیا۔ شکریہ! پرچہ بہت خوبصورت ہے۔ مبارکباد لیجئے۔

● [illegible]

▼ "دستک" کا پہلا شمارہ موصول ہوا، دیکھ کر اور پڑھ کر بیحد مسرت ہوئی۔ خاص کر اس لئے کہ آپ نے اس رسالے کا ادبی معیار قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

منٹو کی فحش نگاری کے بارے میں گیان چند صاحب نے بڑے سیدھے سبھاؤ سے ایک باوقار فیصلہ سنایا ہے۔ اسی طرح وزیر آغا نے مظفر حنفی کی شاعری کے کلیدی رجحانات کو اجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ائیکل مدھوسودن دت پر جناب شہزاد منظر کا مضمون اردو والوں کے لئے گیان کے کئی دروازے کھولتا ہے۔ میں نے سارے مضامین دلچسپی سے پڑھے اور ترتیب و تدوین نیز مضامین کی فراہمی میں آپ کی سعی کی داد دی۔

خدا کرے دستک وقت کی پابندی کے ساتھ برابر شائع ہوتا رہے اور اس پر کھل منڈن کی کیفیت نہ طاری ہو جیسا کہ عام طور سے اردو رسالوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

● مناظر الحق عاشق، کانپور

▼ بھئی آپ نے تو چونکا کر رکھ دیا۔ آپ رسالہ بہتر نکالیں گے اس کی تو امید تھی مگر اتنا بہتر نکالیں گے نہیں معلوم تھا۔ رسالہ بہتر اور اتنا وقیع ـــــ سچ، یہ کسی شہ پارہ سے کم نہیں۔ اس کی فہرست دیکھ کر تو آپ کے اثر و رسوخ کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ پہلے شمارہ میں ہی اتنے اچھے ناموں کو یکجا کر لینا بہت آسان نہیں، ترتیب کے کیا کہنے۔ نہایت دلکش اور سنجیدہ، اس کی یہ انفرادیت اسے دوسرے رسالوں سے امتیاز اور نمایاں حیثیت عطا کرتی ہے اس میں شامل مضامین، کہانیاں، منظومات وغیرہ کا انتخاب اتنی سنجیدگی اور احتیاط کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس سے آپ کی مدیرانہ صلاحیت پوری طرح ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ انشائیہ، ترجمہ اور ثقافت کا کالم تو اسے مزید شوخ بخش رہا ہے۔ البتہ ترتیب و مواد کے مقابلے میں سرورق بہت زیادہ متاثر نہیں کر سکا۔

● حنیف رحمانی، آرہ

سہ ماہی دستک دیکھا۔ توقع پسند آیا۔ آپ کا رسالہ ادبی ہونے کے علاوہ ثقافتی و تہذیبی بھی ہے۔ ایسے رسالے ہمارے ملک ہندوستان میں کم بہت کم ہیں۔

● محمد خالد عابدی، بھوپال

نئے سال کا تحفہ "دستک" کی شکل میں نصیب ہوا۔ امسال اس قدر حسین ترین تحفہ پاکر نگاہ و دل کے ساتھ ساتھ روح بھی سرشار ہوگئی۔

بھئی! میں آپ کے حوصلوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کیوں کہ اس دورِ گرانی میں ایسا جریدہ نکالنا واقعی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بلا شبہ اس جریدے کو ترتیب دینے میں حسن و معیار کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جو سراہنے کے قابل ہے۔

ظفر گورکھپوری، ممتاز راشد، کرشن کمار طور اور امیر قزلباش کی غزلوں کو چھوڑ کر (چونکہ یہ غزلیں دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہو چکی ہیں)، تمام نثری و منظوم تخلیقات میں تازگی، عمدہ کاغذ، خوبصورت گٹ اپ، خوشنما کتابت اور صاف ستھری طباعت دل کو چھوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

● فراغ روھوی، کلکتہ

اردو کے اس شاندار رسالے کی اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

صوری اور معنوی دونوں ہی اعتبار سے یہ رسالہ قابلِ ستائش اور آپ کی مدیرانہ سلامیت، کا ایک بہت معتبر اظہار ہے۔ اس کی طویل اور کامیاب زندگی کے لئے خلوص دل سے دعا گو ہوں۔

● ھمدرف جعفری، اروناچل پردیش

آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا پہلا سہ ماہی جریدہ "دستک" پہلی نظر میں قاری کو توجہ کرتا ہے، ہوڑہ کی سرزمین سے شائع ہونے والا غالباً یہ پہلا پرچہ ہے جو اس قدر خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ ساتھ ہی قیمتی مواد سے مزین بھی۔

عام روِیہ ہے کہ اردو میں اخبار یا رسالہ شائع کرنا گھاٹے کا سودا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس گھاٹے کے سودے کو آنے والی نسل ضرور تحسین آمیز نظروں سے دیکھے گی۔

زیر نظر شمارے میں بعض نظمیں اور غزلیں بہت متاثر کرتی ہیں لیکن ایک پرچہ میں تقریباً ۷۵ غزلیں اور ۲۸ نظموں کو شامل کرنے کی تک سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

● مشتاق انجم، ہوڑہ

DASTAK - 2

(An Urdu Literary Magazine)

51/16, Cowies Ghat Road, Shibpur,
Howrah-711 102 (West Bengal) INDIA